آوازِ دوست

مختار مسعود

آوازِ دوست

مختار مسعود

پرِ کاہ اور پارۂ سنگ

کے نام

وہ پرِ کاہ جو والدہ مرحومہ کی قبر پر اُگنے والی گھاس کی پہلی پتّی تھی

اور

وہ پارۂ سنگ جو والدِ مرحوم کا لوحِ مزار ہے

فہرست

اس کتاب میں صرف دو مضمون ہیں۔ ایک طویل مختصر اور دوسرا طویل تر۔ ان دونوں مضامین میں فکر اور خون کا رشتہ ہے۔ فکر سے مراد فکرِ فرداہے اور خون سے خونِ تمنّا۔

۲۲ کوپر روڈ

۱۸ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ

۱۲۷ اکتوبر ۱۹۷۴

مختار مسعود

مینارِ پاکستان

مینارِ قراردادِ پاکستان کی مجلسِ تعمیر کی نشست تھی، میز کے اِرد گرد تمام اراکین جمع تھے، میں آج اُن میں پہلی بار شامل ہوا تھا۔ کارروائی کی پہلی شِق غور کے لیے پیش ہوئی، میرا ذہن اس وقت برنارڈ شا کے اِس مقولے پر غور کرنے میں مصروف تھا کہ وہ مقام جہاں خواہشِ قلبی اور فرضِ منصبی کی حدیں مِل جائیں اُسے خوش بختی کہتے ہیں۔ میں بلحاظِ عہدہ اِس مجلس کی صدارت کر رہا ہوں مگر عہدے کو ایک عہدِ وفا کا لحاظ بھی تو لازم ہے۔ میرے عہدے کا تعلّق تعمیر سے ہے، میرے عہد کا تعلّق تحریک سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اُسے سنگ و خشت کے بجائے جہانِ نَو کی تعمیر اور افکارِ نَو کی تعبیر سمجھا۔ میں نے اِس مینار کو

باالفاظِ اقبال جلوہ گاہِ جبرئیل جانا اور سوچا۔

با کہ گویم سرِّ این معنی کہ نورِ روئے دوست

با دماغِ من گل و با چشم موسےٰ آتشست

عرفیؔ

مینار کی تعمیر کے ابتدائی دِنوں میں جب میرا اِس کی تعمیر سے کوئی سرکاری تعلّق نہ تھا میں محض تعلّقِ خاطر کے واسطہ سے وہاں جا پہنچا۔ بنیادیں بھری جا چکی تھیں، باغ میں ہر طرف ملبہ پھیلا ہوا تھا، مینار بُلندی کی طرف مائل تھا، روکار بانسوں کی باڑ میں یوں چھُپی ہوئی تھی کہ عمارت تو نظر نہ آئی مگر اُردُو شاعری میں چِلمن کا مقام مُجھ پر واضح ہو گیا۔ نزدیک جانا چاہا تو چوکیدار نے سختی سے روک دیا۔ یہ تو اُس چوکیدار کا ہمسر نکلا جسے مولوی عبد الحق نے وائسرائے کو ٹوک دینے پر آثارِ قدیمہ سے نکال کر چند ہم عصروں میں شامل کر لیا تھا۔ اب کہاں روز روز عبد الحق پیدا ہوں گے اور کِسے فرصت ہو گی کہ عصرِ نَو کے ملبے میں عزّتِ نفس

کی تلاش کرے اور ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات پر مضمون لکھا کرے۔ میں نے چوکیدار سے پوچھا یہ کیا بن رہا ہے؟ کہنے لگا یادگار بن رہی ہے۔ آج جب کارروائی کے لیے پہلا مسئلہ پیش ہوا تو میں نے کہا اِسے ملتوی کیجئے تاکہ ایک اور ضروری بات پر بحث ہو سکے۔ میز پر لغّات کا ڈھیر لگ گیا۔ سب متّفق ہوئے کہ یادگار وہ نشانِ خیر ہے جو مرنے کے بعد باقی رہے۔ جب یادگار کا عام تصوّر موت اور فنا کے تصوّر سے جُدا نہ پایا تو منصوبے سے یادگار کا لفظ خارج کر دیا۔ میز صاف کی گئی، لغّات کی جگہ مینارِ قرار دادِ پاکستان کے نقشے پھیلائے گئے۔ جو تھوڑی بہت جگہ بچ گئی اُس میں چائے کی پیالیاں سجائی گئیں۔ چائے شروع ہوئی تو بات بہت دُور جا نکلی۔

کہتے ہیں جب اہرامِ مصر کا معمار موقع پر پہنچا تو اُس نے صحرا کی وسعت دیکھ کر فیصلہ کیا کہ عمارت بُلند ہونی چاہیئے۔ پھر اُس نے بھُر بھُری اور نرم ریت کو محسوس کیا اور سوچا کہ اس عمارت کو سنگلاخ بھی ہونا چاہیئے۔ جب دھوپ میں ریت کے ذرّے ٹپکنے لگے تو اُسے خیال آیا کہ اُس کی عمارت شعاعوں کو منعکس

کرنے کے بجائے اگر جذب کرلے تو کیا اچھا تقابل ہو گا۔ ہوا چلی تو اُسے ٹیلوں کے نصف دائرے بنتے بگڑتے نظر آئے اور اُس نے اپنی عمارت کو نوک اور زاویے عطا کر دیے۔ اتنے فیصلے کرنے کے بعد بھی اُسے طمانیت حاصل نہ ہوئی تو اس نے طے کیا کہ زندگی تو ایک قلیل اور مختصر وقفہ ہے، وہ کیوں نہ موت کو ایک جلیل اور پائیدار مکان بنا دے۔ اب جو یہ مکان بنا تو لوگوں نے دیکھا کہ عجائبِ عالم کی فہرست میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اہرام کے معمار کو اگر اقبال پارک میں لا کھڑا کرتے تو اُسے نہ جانے کیا کُچھ نظر آتا اور وہ اس عمارت کو نہ معلوم کیا شکل دیتا۔ اُس کی غیر حاضری میں ہمیں یہ طے کرنے میں بڑی مُشکل پیش آئی کہ قراردادِ پاکستان کو علامت اور عمارت کے طور پر کیا صورت دی جائے۔ باغ جھیل، فوّارے، مسجد، کتب خانہ، عجائب گھر، ہال، ہسپتال، دروازہ، درس گاہ یا مینار۔ فہرست کُچھ اسی قسم کی بنی تھی اور بحث و تمحیص کے بعد کامیابی کا سہرہ سرِ مینار سجایا گیا۔ موقع و محل کی نسبت ہو یا صورت و ساخت کی نسبت ماہرین کا متّفق ہونا ممکن نہیں۔ اقبال پارک کے مشرق اور شمال میں وسعت اور ہریالی،

مغرب میں ایک محلہ، کچھ جھگیاں اور گندہ نالہ، جنوب میں قلعہ، گوردوارہ اور مسجدِ عالمگیری واقع ہے۔ سطحِ زمین سے دیکھا جائے تو تین سفید بیضوی نوک دار گنبد اور چار بُلند سُرخ پہلو دار مینار اس قطعے پر حاوی ہیں۔ ذرا بُلندی سے دیکھیں تو اندرون شہر، دریائے راوی اور جہانگیر کے مقبرے کے چار مینار بھی اِس منظر کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ آٹھ میناروں کے ہوتے ہوئے نویں مینار کا اضافہ کسی نے حسن جانا اور کسی نے بد ذوقی۔ اس بات کو البتّہ سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ عمارت اپنی نسبت کی حیثیت سے منفرد ہے۔ دنیا میں کہیں کِسی قرار داد کو منظور کرنے کی یاد اس طرح نہیں منائی گئی کہ جلسہ گاہ میں ایک مینار تعمیر کر دیا جائے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مینار کی ابتدائی صورت دفاعی ضرورت کے تحت وجود میں آئی، پھر اُس کی علامتی حیثیت قائم ہوئی، اِس کے بعد یہ دین کا ستون بنا اور آخر کار نشانِ خیر کے طور پر بنایا جانے لگا۔ مینارِ قرارداد اُن ساری حیثیتوں پر محیط ہے۔ یہ نظریاتی دفاع کی ضرورت، تحریک آزادی کی علامت، دین کی سر فرازی کا گواہ اور ہماری تاریخ کا ایک نشانِ خیر ہے۔

دفاعی میناریوں تو میسوپوٹیمیا کی اختراع بتائے جاتے ہیں۔ مگر اُن کو سب سے زیادہ استعمال کرنے والے اہلِ روم اور باز نطینی تھے۔ اُن کے یہاں شہر کی فصیل سے لے کر ہر بڑی حویلی میں جابجا مینار بنے ہوئے تھے۔ ان دِنوں دنیا کی آبادی مختصر اور جغرافیے کا عِلم کم تر تھا۔ فنِ حرب کا درجہ بھی پست تھا، حملہ آور گنے چُنے اور اُن کے ہتھیار دیکھے بھالے تھے لہٰذا دفاع کے لیے یہ کوتاہ قامت مینار ہی بہت کافی تھے۔ علم اور آبادی دونوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ فنِ حرب کا درجہ بھی بُلند ہوتا چلا گیا، جنگوں کی تعداد اور شدّت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ جگہ جگہ مضبوط سے مضبوط اور بُلند سے بُلند تر مینار بننے لگے۔ آبنائے باسفورس، جنوبی فرانس اور وسط چین کی مشہور فصیلیں اور مینار اس دور کی یادگار ہیں۔ دیوارِ چین میں جو اب ہاتھی کے دانت کی طرح صرف دِکھانے کے کام آتی ہے، جابجا دفاعی مینار اور بُرج بنے ہوئے ہیں۔ چین گئے تو دیوار دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دیوار بھی دیکھی اور اہلِ دیوار بھی۔ معلوم ہوا کہ جو کام پہلے دیواروں سے لیا جاتا تھا وہ اب دیوانوں سے لیتے ہیں۔ جہاں لوگ شانہ بشانہ صف بہ صف ایک

دوسرے سے پیوست ہو جائیں تو وہی سدِّ سکندری ہے اور وہی سدِّ یاجوج۔ ایک دِن ہم دیوار کی طرف روانہ ہوئے۔ سڑک میدان سے گُزر کر پہاڑی سلسلے میں داخل ہو چکی تھی۔ دُور سے ایسا معلوم ہوا کہ جہاں پہاڑ اور اُفق ملتے ہیں وہاں کسی نے سیاہ پنسل سے ایک مدھم سی لکیر لگا دی ہے۔ کچھ اور آگے گئے تو دُور تک سلسلہ کوہ سنجافی نظر آیا۔ نزدیک پہنچے تو یہ مدہم سی لکیر حیرت کدۂ ہنر بن گئی اور جسے ہم نے سنجاب سمجھا تھا وہ ایک سنگلاخ حقیقت نکلی۔ دیوار عمود وار ایک پہاڑی پر چڑھتی تھی اور چوٹی پر ایک دفاعی مینار بنا ہوا تھا۔ میں نے جیب سے پچاس یوآن کا نوٹ نکالا اور ساتھیوں سے کہا کہ یہ انعام مینار پر سب سے پہلے پہنچنے والے کو ملے گا۔ سبھی بھاگ پڑے اور میں نے جانا کہ یہ نوجوان بھی پسماندہ ملکوں کی طرح زرِ مبادلہ کی دوڑ میں شریک ہو گئے ہیں۔ ذرا سی دیر میں بھاگنے والوں کا دم پھول گیا اور وہ ایک ایک کر کے فرش پر بیٹھ گئے۔ مینار اب بھی اُتنا ہی دور نظر آتا تھا اور اگر اس میں یہ خوبی نہ ہوتی تو اب تک دیوارِ چین میں کئی بار نقب لگ چکی ہوتی۔ یہ کام جو بڑے بڑے ملک نہ کر سکے اُردُو شاعری

نے کر دکھایا، شعر ہے۔

میرے شیون سے فقط قصرِ فریدوں نہ گرا

سدِّ اسکندر اورنگ نشیں بیٹھ گئی

اب صرف حضرت ناظمؔ کو جن کا یہ شعر ہے کیوں قصور وار ٹھہرایئے، قصور ہے تو خود ہمارے مزاج کا۔ دیوارِ چین تو نہیں البتّہ دیوارِ چمن تو حضرت غالبؔ نے بھی ڈھادی تھی، کہتے ہیں۔

برشگالِ گریہ عاشق ہی دیکھا جائے

کھل گئی مانندِ گُل، سو جا سے دیوارِ چمن

دفاعی مینار پر چڑھنے کی جو حسرت دل کی دل میں رہ گئی تھی اُسے میں نے مغربی پاکستان کے قبائلی علاقے میں جا کر پورا کیا۔ میں نے ایک سردار کے یہاں کھانا کھایا اور مہمان کا حقِ آسائش استعمال کرتے ہوئے مٹّی کے اُس مینار پر جا چڑھا جو

حویلی کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ باہر سے تو اُس کی لپائی کی ہوئی تھی مگر اندر سے مینار تاریک اور خستہ تھا۔ خاک ریز سے جو روشنی کی کرن اندر آتی تھی وہی ہمارا زینہ تھا۔ مینار کی شہ نشین میں ایک ٹوٹی کرسی اور چند کارتوس پڑے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک ٹرانسسٹر بج رہا تھا۔ میں نے کبھی ٹاٹ میں مخمل کا پیوند تو نہیں دیکھا مگر میسوپوٹیمیا کے دفاعی میناروں کی طرز کے ہزار ہا سال پرانے مٹّی کے میناروں میں بیسویں صدی کا گاتا بجاتا پیوند لگا ہوا ضرور دیکھا ہے۔

سمندر کے کنارے جو مینار نشانِ راہ کے طور پر بنائے جاتے ہیں اُن کے بالائی حصّے رات کو روشن رہتے ہیں اس لئے انہیں روشن مینار کہتے ہیں۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ یہ مینار طوفانی علاقوں میں خطرناک چٹانوں پر بنائے جاتے ہیں اور اُن میں رات کو روشنی کرنے والے کی زندگی جفاکشی اور تنہائی سے عبارت ہے۔ اگر طوفان آجائے تو دِنوں تک اہلِ مینار کا تعلق دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے۔ میں ایک ایسا ہی روشن مینار دیکھنے گیا۔ ہر چیز بدل چکی تھی، روشنی اب تیل سے نہیں بلکہ گیس اور بجلی سے کی جاتی ہے، مینار والے کی نوکری تخفیف میں آچکی ہے، اب

اِن میناروں کو کسی رکھوالے کی ضرورت نہیں رہی۔ سبکساراِن ساحل شام کو بٹن نیچے کر دیتے ہیں اور صُبح کو اُوپر۔ آہستہ آہستہ پُرانے بادہ کش اُٹھتے جارہے ہیں۔ ترقّی نے انفرادی صفات کے اظہار کی کتنی ہی راہیں بند کر دی ہیں اور شجاعت زندگی کے کتنے ہی شعبوں میں غیر ضروری بلکہ مُضر قرار دے دی گئی ہے۔

میں نے ایک اور روشن مینار بھی دیکھا ہے۔ پہلے تو یہ میرے ذہن میں نقشے پر لگے ہوئے ایک نقطے کی صورت میں محفوظ رہا اور پھر ایک دِن آنکھیں جھپکیں تو وہ نقطہ مینار بن چکا تھا۔ ایشیا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو سائبیریا سے لنکا تک خُشکی نظر آتی ہے۔ لنکا کے جزیرے کی شکل نقشے میں دیکھی تو گمان گزرا جیسے قدرت کی آنکھوں سے خشکی کا آخری قطرہ ٹپک کر سمندر میں گر پڑا ہو۔ اِس جزیرے کی جنوبی حد ہمارے نقشے میں زمین کی آخری حد تھی۔ اسکول کے طالبِ علم نے سوچا کہ خشکی کی اِس حدِّ آخر پر کھڑا ہو کر اگر یہ کہیں کہ ایشیا میرے قدموں میں سائبیریا تک پھیلا ہوا ہے تو یہ بات جغرافیے کی رو سے درست اور تاریخ کی رو سے نادرست ہو گی۔ یہ خیال نہ جانے کب آیا اور کتنے سال لاشعور میں گُم رہنے

کے بعد ایک دِن مُسکراتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔ میں ایک بحری جہاز کے عرشے پر کھڑا تھا۔ اعلان ہوا کہ اب ہم لنکا کے گرد گھومتے ہوئے جزیرے کی جنوبی حد کے پاس سے گُزر رہے ہیں۔ میری آنکھوں میں چمک آ گئی۔ سامنے جزیرے کے آخری ساحل پر ایک روشن مینار دمک رہا تھا۔

میناروں کی ایک قسم اور بھی ہے۔ کسی زمانے میں اُونچے بُرج اس لئے بنائے جاتے تھے کہ عالمِ بالا تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ جب شیخ شہاب الدّین نے محمد تغلق کو سلطانِ عادل کہنے سے انکار کر دیا تو انہیں ایک مینار پر لے گئے اور بغیر سیڑھیوں کے نیچے اُتار دیا۔ انجام ظاہر ہے میں نے محمد تغلق کا بُرج تو نہیں دیکھا مگر لندن میں وہ عمارت دیکھی ہے جسے ٹاور آف لندن کہتے ہیں۔ کوہ نور ہیرا اِس عمارت میں محفوظ ہے۔ میں بڑے شوق سے اُسے دیکھنے گیا۔ ہر قدم پر شوق کو اُکساتا رہا مگر گائیڈ دیر تک اِسی قسم کی اطلاعات فراہم کرتا رہا کہ اِس مقام پر ملکہ الزبتھ قید تھی اور اِس مقام پر فادر فشر بند تھا۔ جب ہم کوہ نور تک پہنچے تو شوق کی آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ہیرا دیکھ کر مُجھے مایوسی ہوئی۔ نادر شاہ نے خواہ مخواہ اِس

پتھّر کے لئے قتلِ عام کیا اور یونہی اپنی نئ ٹوپی اِس کی خاطر ایک بوسیدہ پگڑی سے بدل لی۔ مُجھے تو یہ ہیرا ایک آنکھ نہ بھایا مگر جب رنجیت سنگھ نے اِسے دیکھا تو بقول مورخ "سرکار دولت مدار از مشاہدہ الماس بسیار از بسیار منفرح و منشرح شدہ۔۔۔" میں جواہرات کے کمرے سے دل گرفتہ باہر آیا۔ گائیڈ بولا یہاں ملکہ این، ملکہ کیتھرائن، سر تھامس مور اور لیڈی جین گرے کے سر جلّاد نے قلم کیے تھے، اس حصّے کو "بلڈی ٹاور" کہتے ہیں۔ میں نے دِل ہی دِل میں اِس کا ترجمہ کیا، خُونی برج۔ میں نے گائیڈ سے پوچھا آپ کے یہاں کوئی ایسا مینار بھی ہے جس کے ساتھ گناہ اور جُرم کی کوئی روایت وابستہ نہ ہو۔ وہ فخر سے بولا، کیوں نہیں۔ آپ پارلیمنٹ ہاؤس کا گھنٹہ گھر دیکھئے جسے "بگ بن" کہتے ہیں۔ میں نے کہا کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کی نو آبادیاں آپ کے اس جواب کو درست تسلیم کر لیں گی۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا۔ بگ بن کا گھڑیال بجنا شروع ہوا۔ بے حد سُریلا اور رسیلا، موسیقی کی لہر آئی اور بہا کر لے گئی۔ مجھے بگ بن اچھی لگنے لگی۔ کچھ دیر کے لئے میں نے اپنا شکوہ اور اپنا سوال دونوں کو فراموش کر دیا اور یوں

اس خود فراموشی کا شکار ہو گیا جو غیر مُلک میں ہمارا عام شیوہ بنتا جا رہا ہے۔

یورپ میں میناروں کی تلاش میں نکلا تو بیشتر گرجا گھر میں ملے یا گھنٹہ گھر میں۔ کچھ مینار پرانے قلعوں کے دیکھے اور کچھ پرانے محلات میں نظر آئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو دریا پر بنے ہوئے پرانے زمانے کے پُلوں کا حصّہ تھے۔ فرانس میں روئن کیتھیڈرل (Rouen) اور انگلستان میں ویسٹ منسٹر کیتھیڈرل کے میناروں کی تزئین پسند آئی۔ سوچا اب ایک مشہور سر نگوں اور خمیدہ مینارِ پیسا (Pisa) میں باقی رہ گیا ہے اُسے بھی دیکھ آؤں۔ تفصیلات منگوائیں تو معلوم ہوا کہ خمیدہ میناروں کا ایک جوڑا بولونہ (Bologna) میں ہے۔ ایسنلی ٹاور (Axinellid Tower) ۱۱۰۴ء میں بنا اور ۳۲۰ فٹ اونچا ہے۔ اس کے ساتھ دس سال بعد بنا ہوا اور اس سے نصف قامت کا دوسرا خمیدہ مینار گاریسندو ٹاور (Griselda Tower) کھڑا ہے۔ میں پیسا اور بولونہ دونوں کے درمیان فیصلہ نہ کر سکا اور اِن تینوں خمیدہ میناروں سے محروم رہا۔

پیرس میں دیکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں رکھا ہے مگر کچھ ایسے کم ہمّت بھی ہیں جو

لوور (Louvre) گیلری اور ایفل ٹاور پر قناعت کرتے ہیں۔ سُنا ہے کہ ایفل ٹاور کی ایک نقل جاپان میں چند سال ہوئے تعمیر کی گئی ہے اور بعض جگہ لوگ اُس نقل کی نقل بھی کر رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ میناروں کی منزلِ بالا گر جاتی ہے یا خطرے کے پیشِ نظر گرا دی جاتی ہے اور یوں بہت سے مینار عمر گزرنے کے ساتھ قد کاٹھ میں چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ ایفل ٹاور ۱۸۸۹ء میں بنا مگر اُس کا قد اسّی سال کی اِس مدّت میں گھٹنے کے بجائے ۵۵ فٹ اور بڑھ گیا ہے۔ یہ اضافہ ٹیلی وژن کے مستول کی وجہ سے ہوا ہے۔ دنیا بھر میں ٹیلی وژن کی ایجاد نے کئی عمارتوں، شہروں اور انسانوں کو اُن کے اصلی قد سے اونچا کر دکھایا۔ لندن ہی کو لے لیجئے، اس کوتاہ قامت شہر نے بھی اپنے ڈاک خانے اور ٹیلی وژن کے لئے ایک مینار بنا لیا ہے۔ رہا قامتِ یار کا مسئلہ تو بسا اوقات پروگرام دیکھتے ہوئے یہ مصرعہ گنگنانے کو جی چاہتا ہے ؎

من اندازِ قدرت رامی شناسم

مینار حال ہی میں ایک نئے استعمال میں آ گیا ہے۔ سیاٹل Seattle کی عالمی

نمائش کے سلسلے میں پہلی بار سُننے میں آیا کہ ایک مینار محض اس لئے بنایا جائے گا کہ مینار کے گنبد میں ریستوران کھولا جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنی ہی طعام گاہیں ہوا میں بُلند ہو گئیں۔ اب آپ نہ صرف چائے کی پیالی پینے کے لئے قطب مینار سے دُگنی بُلندی تک جاسکتے ہیں بلکہ جب تک آپ وہاں چائے نوشِ جاں فرمائیں گے وہ ریستوران گھومتا رہے گا۔ آپ نے وہ کرتب تو ضرور دیکھا ہو گا کہ ایک بازی گر تھالی کو چھڑی کی نُوک پر رکھ کر گھماتا ہے۔ اب اُس تھالی میں آپ کو چائے کی پیالی دے کر بٹھا دیا جائے تو یہ نیا اور گھومنے والا مینار ریستوران بن جائے گا۔ میں ایسی گھُومنے والی طعام گاہوں کو گردشِ زمانہ کی علامت سمجھتا ہوں۔ دنیا اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔ سورج کے گرد بھی چکّر لگا رہی ہے۔ ہر ذرّے میں اُس کی دنیا علیحدہ گردش کر رہی ہے۔ انسان اپنی احتیاج کے محور پر بھی گھومتا ہے اور چڑھتے ہوئے سورج کا طواف بھی کرتا ہے۔ کسی شاعر نے گردشِ مدام سے گھبرانے کا گلہ کیا تھا۔ مگر انسان ابھی تو اُس سے لُطف اندوز ہو رہا ہے۔ اب اس کی طعام گاہیں بھی گردش میں آ گئی ہیں۔

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مجلسِ تعمیر کے ایک رکن قدیم تعمیرات کے ماہر ہیں۔ ایک دن اُن سے گفتگو ہوئی تو کئی عقدے کھلے اور کتنی ہی گرہیں مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ دنیائے اسلام کا سب سے پرانا مینار جو آج بھی موجود ہے مسجد بنو اُمیّہ کا مینار ہے۔ ایک دن دمشق کے ایک بازار میں پھِر رہا تھا جس پر خم دار ٹین کی چادروں کی چھت ایسے پڑی ہوئی تھی جیسے ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہو۔ ایک جگہ سے دو چار چادریں غائب تھیں اور اُس حصّے سے سورج بھی جھانک رہا تھا اور ایک مینار کی رفعت بھی۔ میں نے اُس مینار کی ایک تصویر بنائی۔ اُسے دیکھتا ہوں تو خود حیرت کی تصویر بن جاتا ہوں۔ مسجد بنو اُمیّہ کا یہ شمالی مینار آج سے پورے تیرہ سو دو سال قبل بنا تھا۔ یہ ہمارے میناروں کا امام ہے۔ اِس کے پیچھے لاتعداد مینار دست بستہ کھڑے ہیں، ایک نیا مقتدی ابھی آخری صف میں آن کر شامل ہوا ہے، اسے مینارِ قراردادِ پاکستان کہتے ہیں۔ انہیں صفوں میں مغرب اسلام کے مربع اور کثیر الزاویہ مینار بھی کھڑے ہیں اور مشرق اسلام کے گول اور نوک دار مینار بھی

موجود ہیں۔ چند میناروں پر تزئین برجستہ ہے اور چند تزئین پیوستہ کے نمونے ہیں۔ کہیں پرچیں کاری ہے تو کہیں منبّت کاری، کہیں پتھر نیم مصفّا ہے اور کہیں اینٹیں ہزار باف۔ کچھ مینار بنیاد سے رفعت تک یکساں ہیں اور کچھ منزل بہ منزل مختلف ہیں۔ ان میں قیروان کی مسجد کا بھاری بھر کم مینار بھی شامل ہے جو دمشق کے مینار کے بعد شاید قدیم ترین مینار ہے۔ مینار قیروان کی ایک نقل قاہرہ میں ۳۰۰ سال بعد تعمیر کی گئی مگر آج اصل کی حالت نقل سے بہتر ہے۔ ان صفوں میں کچھ جگہیں خالی بھی ہیں۔ یہاں پہلے مینار تھے اب محض اُن کا نام باقی رہ گیا ہے۔ قرطبہ میں عبد الرحمان اوّل کا مینار ہوا کرتا تھا۔ آج اُس کا نشان بھی نہیں ملتا۔ عبد الرحمان نے سرزمینِ اُندلس میں کھجور کا جو پہلا پودا لگایا تھا اُس کا نشان بھی اگر کہیں ملتا ہے تو صرف بالِ جبریل میں۔ علامہ اقبال نے اُس کھجور کے درخت کی غربت کی نسبت جو کچھ کہا وہ اندلس کے پہلے مینار کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے

مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اقبال کے اس شعر کی تشریح کے لیے سیاحت شرط ہے سو وہ اگر منظور ہو تو وسط ایشیا کے دور اُفتادہ علاقوں میں بھی کچھ وقت گزارنا چاہیے۔ کاروانِ اسلام وہاں بھی خیمہ زن ہوا تھا اور اس خیمے کی طنابیں جر قورغان، بخارا، وابکند، سمر قند اور خیوہ کے ان میناروں سے باندھی گئی تھیں جو آج بھی وہاں موجود ہیں اور جِن کی خوشنمائی اور خامشی وہی بات کہہ رہی ہے جو شاعر سے نقشِ پا کی شوخی نے کہی تھی یعنی

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

جر قورغان میں ایک مینار ساڑھے آٹھ سو سال پرانا ہے۔ اس مینار کی ساخت اور صورت ایسی ہے جیسے بنیاد سے کئی مینار اُٹھے ہوں اور بُلندی پر انہیں قرآنی آیات کی خشتی پٹی سے باندھ کر یک جان کر دیا ہو۔ اِن میناروں کی تعداد سولہ ہے جن سے مل کر یہ ایک مینار بنا ہے۔ معمار سے چُوک ہو گئی، انہیں سولہ نہیں بہتّر

ہونا چاہیئے تھا۔ وابکند کا مینار بہت سُبک ہے، اُسے دیکھ کر صراحی دار گردن یاد آ جاتی ہے۔ سمرقند میں بی بی خانم کا مینار ساڑھے پانچ سو سال پرانا ہے۔ اس خشتی مینار میں رنگین لوحیں بھی ہیں اور اقلیدسی شکلیں بھی۔ خیوہ تو گویا میناروں کا شہر ہے۔ مسجد جامع کا مینار، مدرسہ قلی خان کا مینار، مدرسہ امین خان کا مینار اور خواجہ اسلام کا مینار سبھی خیوہ ہی میں تو واقع ہیں۔ خواجہ اسلام کا مینار سب سے کم عمر ہے مگر خاتم کاری میں اس پائے کا مینار شاید ہی کہیں نظر آئے۔ بخارا کا مینار کلاں ۱۱۲۷ء میں بنا تھا۔ اس مینار میں اینٹوں کی چنائی سے آرائش اور ان کی سطح کے فرق سے زیبائش کا سامان پیدا کیا گیا ہے۔ فوقانی منزل پر غالب کاری کا ایک خوبصورت نمونہ موجود ہے اور اس سے ذرا بلندی پر کائی جمی ہے اور گھاس اُگی ہوئی ہے۔ کائی اور گھاس تو پستی کی علامتیں ہیں۔ انہیں سرِ مینار دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہر بلندی پستی کی زد میں ہے۔

اندلس میں مینار مٹ گئے، وسط ایشیا میں اُن پر کائی جم چکی ہے۔ کچھ مینار ایسے بھی ہیں جو مِٹے تو نہیں مگر گُم ہو گئے ہیں۔ اِن میناروں میں غزہ کی جامع مسجد کا مینار،

الخلیل کا مینار اور قُطب مینار شامل ہیں۔ میں ان گُم شدہ میناروں کی بد حالی سے دِل گرفتہ ہوا اور دوسرے مُلکوں میں میناروں کی تلاش ترک کر کے وطن واپس آ گیا۔ یہاں میری جستجو کا استقبال کرنے والوں میں منوڑہ کا روشن مینار، سکھر کے معصوم شاہ کا مینار، لائل پور کا چوک مینار اور شیخوپورہ کا ہرن مینار شامل تھے۔ ان میناروں کے قد آور ہجوم میں مُجھے ایک چھوٹا سا مینار بھی ملا جسے گڑھی شاہو کا کوس مینار کہتے ہیں۔ تزکِ جہانگیری میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ لاہور سے آگرے تک ہر کوس کے فاصلے پر ایک مینار بنایا جائے اور ہر تین کوس کے فاصلے پر ایک کنواں کھودا جائے۔ اِس حکم کے بہت دِنوں بعد فیض کے اسباب گنائے گئے تھے۔ کیا عجب شاعر نے پُل، چاہ اور مسجد و تالاب کی فہرست تزکِ جہانگیری سے نقل کی ہو۔

مغلوں کا ذکر ہو تو بات بابر سے شروع کرتے اور عالمگیر پر ختم کرتے ہیں۔ بابر نے جتنے مینار بنائے اُن میں ریختہ بالکل استعمال نہیں ہوا کیونکہ وہ جنگ کے میدان میں تعمیر ہوتے تھے۔ تزک میں بابر نہایت ایمان داری اور اطمینان سے

اُن میناروں کا ذکر کرتا ہے جو اُس نے جابجا دُشمنوں کے سروں کو کاٹ کر بنائے تھے۔ رانگا سانگا سے لڑائی ہوئی تو شراب سے توبہ بھی کی اور فتح یابی پر "کلہ مینار" بنایا۔ ایک اور لڑائی میں اچانک دُشمن کے ہزاروں ننگے سپاہی تلوار میں نیزے لہراتے مُقابلے پر آ نکلے۔ وہ اپنے بیوی بچّوں کو قتل کر کے آئے تھے اور دنیا سے یہاں تک تعلقات منقطع کر لیے تھے کہ لباس سے بھی عاری تھے۔ گھمسان کا رن پڑا، بابر کی زرّہ پوش سپاہ جیت گئی اور یوں ستر پوشی کا ایک اور جواز پیدا ہو گیا۔ فتح کی خوشی میں باہر نے قطعہ تاریخ کیا اور اِس کے بعد کا حال تزک میں یوں لکھا ہے۔ "میں نے حسبِ دستور چندیری کے شمال مغربی پہاڑ پر دُشمنوں کے سروں کا ایک مینار بطور یادگارِ فتح چنوایا۔"

بابر کے عہد سے اورنگ زیب کے دور تک مغل فنِّ تعمیر میں بہت ترقی ہو گئی۔ "کلہ مینار" کے بجائے دولت آباد میں فتح مینار بنایا گیا۔ چار نہایت خوبصورت مینار لاہور کی جامع مسجد میں بھی بنائے گئے۔ یہ سنگِ سرخ کے سہ منزلہ ہشت پہلو مینار جن کے اوپر سفید گنبدی بنی ہوئی ہے سادگی اور صنّاعی کے لاجواب نمونے

ہیں۔ پختہ بنیاد مگر آلائشِ دنیا سے بُلند۔ یہ توحید م حقانیت اور رفعت کی علامت ہیں۔ اس برصغیر میں عالمگیری مسجد کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا ہے وہ مینارِ قرار دادِ پاکستان ہے۔ یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں مگر اِن کے درمیان یہ ذرا سی مسافت جس میں سِکھّوں کا گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل میں تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ان تین گمشدہ صدیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی، جب مسجد میں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں، جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے، ملک کے بجائے مفاد اور ملّت کے بجائے مصلحت عزیز ہو، اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبّت ہو جائے تو صدیاں یوں ہی گُم ہو جاتی ہیں۔

آج پھر مجلسِ تعمیر کی نشست تھی۔ میں نے پوچھا اِس مینار کی بنیادیں کتنی گہری ہیں اور اِن میں کون سا مسالا لگایا گیا ہے۔ جواب ملا کہ ماہرین کے تجزیے اور تحقیق کے مطابق بنیادیں بہت گہری کھودی گئی ہیں اور ان کی پائیداری کے لیے

اعلیٰ درجہ کا ریختہ استعمال کیا ہے۔ میں نے دل میں سوال دہرایا، یہ تو پہیلی تھی جس میں بنیادوں کی گہرائی سے مراد محض یادوں کی گہرائی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کیں، میرے سامنے سنگِ بنیاد نصب کرنے کا منظر تھا۔ ایک اسپیشل ٹرین پٹیالہ سے چلی اور صبح ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر کھڑی ہو گئی۔ وائسرائے گاڑی سے نیچے اُترے تو مسٹر پولاک نے جو کمشنر تھے اُن کا استقبال کیا۔ اس کے بعد دو انگریز آگے بڑھے، ایک ڈسٹرکٹ جج تھا اور دوسرا کلکٹر۔ پاس ہی ایک ہندوستانی بھی کھڑا تھا، بھاری بھر کم اور طویل قامت، اس کی پیشانی ترکی ٹوپی میں اور چہرہ گھنی داڑھی میں چھُپا ہوا تھا، اُس نے بھی ہاتھ ملایا اور وائسرائے کو اپنے گھر لے گیا۔ دوپہر کو سنگِ بنیاد کی تنصیب کی تقریب تھی۔ ایک وسیع میدان میں پنڈال سجا ہوا تھا۔ معزّز مہمانوں کا ہجوم تھا، ایک طرف کچھ فاصلے پر بہت سے ہاتھی کھڑے تھے جن پر سوار ہو کر مہمان اِس تقریب میں شریک ہونے آئے تھے۔ میزبان کو مصروف دیکھ کر خیال آتا تھا کہ واقعی ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں ہوتا ہے۔ تقریب تقریروں سے شروع ہوئی اور جب تقریریں ہو چکیں تو مہمانِ

خصوصی اُٹھ کر شامیانے کے اُس سِرے پر گئے جہاں بنیاد رکھنی تھی۔ پہلے کچھ کاغذات اور سِکّے فن کیے گئے پھر ایک پتھر نصب ہوا۔ اِس پتھر پر تین بار ضرب لگا کر لارڈ لِٹن نے کہا، میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ پتھر درست اور موزوں طرح سے نصب ہو گیا ہے۔ یہ اعلان ۲ جنوری ۱۸۷۷ء کو علی گڑھ میں کیا گیا تھا۔ یہ درست اور موزوں طور سے نصب ہونے والا پتھر یوں تو ایک کالج کا سنگِ بنیاد تھا مگر جس روز یہ نصب ہوا گویا اُس روز مینارِ پاکستان کی بنیادیں بھی بھری گئیں۔ سیّد محمود نے جو سپاسنامہ پڑھا اس میں لکھا تھا کہ یہ ملک بھر میں پہلا ادارہ ہے جو مسلمان ایک علیحدہ طبقے کی حیثیت سے اپنی انفرادی ضرورت اور متحدہ خواہش کے تحت قائم کر رہے ہیں اور اس مدرسے کی بنیادیں تاریخ کے اُن تقاضوں میں ملیں گی جن سے یہ ملک پہلے کبھی دوچار نہیں ہوا۔ لیجیے ہم علی گڑھ کی بنیادوں میں مینارِ پاکستان کی بنیادوں کو ڈھونڈ رہے تھے اور سپاسنامہ کہتا ہے کہ علی گڑھ کی بنیاد میں تاریخ کے تقاضوں میں ملیں گی۔

اس روز بہت سی تقریریں ہوئیں اور مقرروں نے مُستقبل کی بات کچھ ایسے کی

جیسے انہیں غیب کا علم ہو۔ وائسرائے نے کہا کہ فہم و فراست کی مستقل اجارہ داری قدرت نے کسی ایک نسل کو نہیں دے رکھی اور نہ اسلام میں کوئی ایسی بات ہے جو ہم انسانی اور تہذیبِ عالمی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہند کے مسلمان نئے میدان فتح کریں اور اپنے پاک عزائم کو پورا کرنے کے لیے تازہ مواقع حاصل کریں۔ ایک انگریز افسر مسٹر کین (Keene) نے کہا کہ آج ہم نے جو کچھ دیکھا ہے یہ جہاں تک پیش گوئی ممکن ہے ایک وسیع اور اہم تحریک کی ابتدا ہے جو تاریخ میں جگہ حاصل کرے گی۔ سپاس نامے میں لکھا تھا کہ یہ بیج جو آج ہم نے کاشت کیا ہے اِس سے ایک تن آور درخت نکلے گا جس کی شاخیں بھی زمین میں جڑ پکڑ لیں گی اور اُن سے نئے اور توانا درخت نکل آئیں گے۔

ہر تقریر دعائیہ تھی اور ہر دُعا قبول ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سر سیّد کے ہاتھوں وہ نیکی ہو رہی ہے جس کے اجر اور اثر کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے کہ اس عمل کی حالت ”ایسی ہے جیسے ایک دانے کی حالت جس سے سات

بالیں جمیں اور ہر بال کے اندر سو دانے ہوں اور یہ افزونی خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں۔"(سورۃ ۲۔ آیت ۲۶۱)

علی گڑھ کو جو افزونی اور وُسعت خُدا نے عطا فرمائی اور جس طرح یہ مدرسہ آہستہ آہستہ ایک مرکز بن گیا اس کا ذکر ایک بار مجلسِ تعمیر میں ہو رہا تھا، مُجھے وقت کے کتنے ہی سنگِ میل یاد آئے جو تقریباً سو سال کی مدّت پر پھیلے ہوئے ہیں مگر علی گڑھ کی نسبت سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں بھی اس کارواں میں شامل ہوں جو بھی وہاں سے گزرا تھا۔ یہ ۱۸۵۷ء ہے، سنگِ میل پر خونِ ناحق کے چھینٹے ہیں، سماں بے نور ہے کچھ نظر نہیں آتا۔ خستہ جانوں کا ایک قافلہ ہے جس میں غالبؔ خستہ بھی شامل ہے۔ غالبؔ ہندو کا مقروض ہے۔ انگریز کو پینشن کی عرضی دیتا ہے مگر اُس کا جواب ہی نہیں آ چکتا۔ لال قلعے کی آخری شمع اب خاموش ہو چُکی ہے۔ کسی کو سوچنے کا بھی یارا نہیں۔ سنگِ میل سے سیّد احمد ٹیک لگائے کھڑے کُچھ لکھ رہے ہیں۔ شاید "رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" کی تصنیف ہو

رہی ہے۔ اگلے سنگِ میل پر ۱۸۲۸ء لکھا ہے۔ سر سیّد بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر کو کہہ رہے ہیں کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا اشتراک کسی صورت میں ممکن نہیں رہا۔

سر سیّد کی ایک رُعب دار روغنی تصویر یونین ہال کی دیواروں پر لگی ہوئی بہت سی تصویروں کے وسط میں آویزاں تھی، اُس کے دائیں اور بائیں قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کی تصویریں تھیں۔ اب ذہن میں جو شکلیں ابھرتی ہیں اُن کا مرکز بھی یہی تین صورتیں ہیں۔ سر سیّد کی تصویر دیکھ کر کبھی تعجب اور تاسف ہوتا کہ اس کے چوڑے چکلے سینے پر انگریزوں کے دیے ہوئے اتنے بہت سے تمغے لگے ہیں۔ تمغوں کے نیچے جھانکا تو اس صحت مند انسان کو دردِ دل کا مریض پایا۔ سُنا ہے مولانا شوکت علی سے کسی انگریز نے کہا تھا کہ سر سیّد کی صورت اور وفاداری پر مت جاؤ۔ یہ ہندوستان کا سب سے بڑا باغی ہے، اِس کی تحریک کی ترقّی کے ساتھ برطانوی عہد کے دن بھی پورے ہو جائیں گے۔

سر سیّد کا مزار ہماری جماعت کے نزدیک ہی تھا۔ مسجد میں داخل ہوں تو شمالی

جانب قبروں کی جو قطار ہے اس کے وسط میں سر سیّد کا مزار ہے۔ ہم نے بار ہا لوہے کے جنگلے کو تھام کر حیرت سے اس کی قبر کو دیکھا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے ریلوے اسٹیشن پر ہندو پانی کی آوازیں سُنیں تو ان کے جواب میں مسلمان تعلیم، کا نعرہ لگایا۔ ہندو پانی اور مسلمان پانی کا فرق اور مفہوم کچھ عرصے کے بعد دو لفظوں میں یوں ادا ہونے لگا۔ علی گڑھ اور بنارس۔ اِن دو شہروں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ دو نئے لفظ سُننے میں آئے، پاکستان اور بھارت۔ یہ بات تو قائدِ اعظم نے علی گڑھ میں ہی کہی تھی۔ پاکستان اُسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا، یہ اُس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا، وہ ایک جُداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی۔ میں نے قائدِ اعظم کی یہ تقریر سُنی تو سوچا علی گڑھ ایک چھوٹا سا پاکستان ہے اور پاکستان ایک بڑا سا علی گڑھ ہو گا۔

یہ اگلا سنگِ میل انیسویں صدی کے کسی آخری سال کا ہے۔ اس کے پاس ایک انگریز کھڑا ہے جس کا نام تھیوڈور ماریسن ہے۔ اُن کی رائے ہے کہ "ہندوستان میں ایک مشترک قوم کا تصوّر نہیں ملتا۔ ہندو اور مسلمان دونوں اپنی جدا مذہبی اور معاشرتی روایات رکھتے ہیں۔ اگر ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمان ہندوستان کے ایک حصّے میں اکٹھا کر دیے جائیں تو ہندوستان کے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں ورنہ نہیں۔" یہ ماریسن وہی ہیں جن کے نام پر مسلم یونیورسٹی میں ایک ہوٹل ماریسن کورٹ کہلاتا تھا۔ اس ہوٹل کی دیواریں ہماری معاشیات کی جماعت سے ملحق تھیں۔ بیچ میں صرف ایک دروازہ تھا جسے شاید باب العلم کہتے تھے۔ یہ ہوسٹل معمولی سا تھا، اُس کی عمارت پر بسا اوقات اصطبل کا گمان گزرتا، کرسی بھی اونچی نہ تھی اور آندھیوں سے کچّے صحن میں ریت اور مٹّی اِتنی بھر گئی کہ اُس کی سطح کمروں کے فرش سے بھی اونچی ہو گئی۔ اس بے کسی کے باوجود اس ہوٹل میں رہنے والوں کی کشادہ پیشانیوں پر ماریسن کی پیش گوئی لکھی ہوئی نظر آتی تھی۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں شملہ وفد نے لارڈ منٹو سے ملاقات کی تھی، اُن کے

سپاس نامے میں بھی آخری مطالبہ یہی تھا کہ ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کی جائے۔ شملہ وفد میں تیس آدمی شامل تھے، اُن میں سے تین کو میں نے اس یونیورسٹی میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے دیکھا ہے جس کے قیام کی درخواست لے کر وہ شملے کی پہاڑیوں پر چڑھے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں سٹاک ہوم سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس میں خیری برادران نے تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی۔ چھوٹے خیری تو علی گڑھ میں پڑھاتے تھے، سنولایا ہوا چہرہ، بیٹھی ہوئی آواز اور کبھی چین سے نہ بیٹھنے والی روح۔ سُنا تھا کہ وہ ہٹلر سے بھی مل چکے ہیں اور ان کے پاس اس کی ایک دستخط شدہ تصویر بھی ہے۔ ہم نے اُن کے گھر میں کئی بار جھانکا تا کہ ہٹلر کی تصویر نظر آئے مگر وہاں تو جرمنی سے لائی ہوئی صرف ایک صورت نظر پڑی اور وہ تھیں ان کی بدیسی بیگم۔ ہم نے اُن کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی تو اسے مصروف یا گنجلک پایا۔ انگریز کیسے نکالا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کو آزادی کی کونسی شکل راس آئے گی، وہ ہر وقت اِسی ادھیڑ بن میں لگے رہتے۔ انگریز کے عہدِ اقتدار میں یہ باتیں شیخ چلی کی سی لگتیں۔ پھر جنگ آئی اور وہ قید کر دیے گئے،

جنگ ختم ہوئی تو رہا ہوئے مگر جلد ہی قیدِ حیات و بندِ غم کو توڑ کر آزاد ہو گئے۔ بر صغیر تقسیم ہوا اور آزادی ملی تو اُسے دیکھنے کے لیے اُن کی جرمن بیوہ رہ گئیں جو اب بھی کراچی میں مقیم ہیں۔

اسی شہر میں اُن کی ایک لڑکی بھی رہتی ہے جس کا مکان ممکن ہے کبھی شاگرد پیشہ ہو مگر ہم سب اُسے بڑی عزّت سے اینکس کہتے ہیں۔ کسی نے اُس لڑکی سے پوچھا کہ مسلم ریاست کے وہ نقشے جو تمہارے والد بناتے تھے اُن میں انہوں نے تمہارے مکان کی جگہ کیوں نہ رکھی۔ کہنے لگیں کہ ابھی ملک کی حدیں ابّا کے مجوزہ نقشے سے ذرا کم ہیں اس لیے بہت سے لوگ بھی بے گھر ہیں۔

۱۹۲۵ء میں ولیم آرچیبالڈ نے کہا کہ شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک طاقتور اتحاد ہوتا نظر آ رہا ہے جس میں افغانستان بھی شامل ہو گا۔ یہ آرچیبالڈ صاحب ایم اے او کالج علی گڑھ کے سابق پرنسپل نکلے۔ چند سال بعد کیمبرج سے ایک تحریک اُٹھی اس کے ایک کارکن تعلیم ختم کرنے کے بعد علی گڑھ آ گئے۔ اُن کا گھر ہمارے سکول کے راستے میں تھا، اُن کا ایک عزیز جو اب اُن کا داماد اور

اُن دنوں ہمارا اہم سبق تھا اُن کے کچھ کاغذات اُٹھالایا، کچھ نقشے تھے جن پر سبز رنگ سے کئی نئے ملک دکھائے گئے تھے، تین نام مُجھے اب بھی یاد ہیں پاکستان، بانگِ اسلام اور عثمانستان۔ ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ کے دو پروفیسروں نے ہندوستان کو تین حصّوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ ایک تو وہی کیمبرج تحریک والے اور دوسرے شعبۂ فلسفہ کے صدر۔ فلسفی پروفیسر کی شکل کچھ برنارڈ شا سے ملتی تھی اور کچھ ٹیگور سے، اُن کی لمبی سفید داڑھی، چمکتی آنکھوں، بھاری اور رعب دار آواز نے فلسفے کے مضمون کے ساتھ مل کر انہیں ایک پُراسرار شخصیت بنادیا تھا۔ وہ دوپہر تک یونیورسٹی میں پڑھاتے اور سہ پہر سے مغرب تک اپنے لان میں مونڈھے پر بیٹھ کر مسلم ہند کے مسائل حل کیا کرتے، ان کا لان مُجھے اپنے گھر سے بھی نظر آتا تھا۔ میں نے کئی بار اُن کو ساتھیوں کے ہمراہ بیٹھے دیکھا اور دل میں سوچا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ گھر کے لان میں بیٹھ کر ہندوستان کو تقسیم کرادیا جائے۔ اگلے ہی سال لاہور میں تقسیمِ ہند کی قرارداد منظور ہوئی۔ اُن کے لان کی رونق میں اضافہ ہوگیا۔ اب وہاں کئی نئے مونڈھے لاکر رکھ دیے

گئے۔ اُن پر ایک نئی نسل آ کر بیٹھ گئی، ایک ٹوٹا ہوا مونڈھا میرے حصّے میں بھی آیا۔

علی گڑھ کی اِس نئی نسل نے قائدِ اعظم کی بگھی کھینچی اور مولانا آزاد کی ریل گاڑی روکی۔ مولانا آزاد دلّی سے کلکتے جاتے ہوئے صرف ایک بار علی گڑھ سے گُزرنے والی ریل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ علی گڑھ میں اُن کی گاڑی کی زنجیر اتنی بار کھینچی گئی کہ طوفان میل گھنٹہ بھر اسٹیشن پر کھڑی رہی۔ پولیس آئی، مسلمان کلکٹر پہنچے، اساتذہ آئے، تب کہیں گاڑی کو جانے کی اجازت ملی۔ انہی دِنوں قائدِ اعظم آئے تو لڑکوں نے فرطِ عقیدت سے بگھی کے گھوڑے کھول دیے اور اُسے کشاں کشاں حبیب منزل تک لے گئے۔ گاڑیاں کھینچنا اور گاڑیاں روکنا تو وقت کی بات تھی۔ وقت بدل گیا ہے۔ تحریکِ پاکستان کی بگھی کے کتنے ہی گھوڑے اب ملازمت کی بیل گاڑی میں جُتے ہوئے ہیں۔ مینارِ پاکستان کی بنیادوں کو تحریک کے مخالفین سے بھی فیض پہنچا ہے۔ اکثریت کی بداندیشی نے مسلمانوں کے لیے جو کنواں کھودا تھا وہی مینار کی بنیاد کے کام آیا۔ اقلیت میں چند دور اندیش

نکل آئے اور وہ دور دور سے بھاری پتھر ڈھو کر لائے تا کہ بنیادیں مضبوط ہوں۔
ان چند معماروں کے پیچھے متعصب اکثریت کی ایک فوج مینار کی تعمیر میں
مصروف ہے۔ یہ فوج کبھی اُردُو زبان پر حملہ کرتی ہے، کبھی مسجد کے آگے باجا
بجاتی ہے، تجارت میں بائیکاٹ کرتی ہے اور ملازمت میں حق مارتی ہے۔ حلال پر
لڑتی جھگڑتی ہے اور حرام کی ترغیب دیتی ہے۔ مدرسوں میں بندے ماترم گاتی
ہے اور مجلسوں میں ترنگے کو سلام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اِس فوج کو جب
صوبائی خود مختاری اور حکومت ملی تو اُس نے عرصۂ حیات بالکل تنگ کر دیا۔ یوپی
کے چیف سیکرٹری نے سرکلر جاری کیا کہ ضلعی افسر مقامی کانگریس کمیٹی سے
سرکاری معاملات میں مشورہ کر لیا کریں۔ اس سرکار کی آڑ میں کانگریس کے
عہدیداروں نے عدالتوں کے فیصلے پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ معاملہ الہ آباد
ہائی کورٹ تک پہنچا۔ عدالتِ عالیہ نے وشوانا تھ مکھر جی کے مقدمۂ توہینِ عدالت
کے فیصلے میں لکھا کہ اب عدالتوں کو اکثر سفارشی خطوط اور احکامات ملتے ہیں۔
انصاف پہلے کہاں اتنا ارزاں اور فراواں تھا ان باتوں سے بالکل نایاب ہو گیا۔

مسلمانوں کی محرومیاں اور زیادہ بڑھ گئیں۔ پھر اس فوج نے دو فیصلہ کُن حملے کئے ایک جان و مال پر دوسرا دین و مذہب پر۔ فساد روزمرہ کا معمول ہو گیا اور گاہے گاہے دِل آزار کتابیں بھی شائع ہونے لگیں۔ مسلمان یہ سب کچھ برداشت کرتا رہا، پھر اس نے ایک چھوٹی سی کتاب پیرپور رپورٹ کے نام سے شائع کی اور یہ شعر لکھ کر اُسے اکثریت کے نام منسوب کر دیا۔

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

ہم وفادار نہیں تو بھی تو دِلدار نہیں!

یہ ڈرامے کا پہلا منظر ہے جس کا عنوان ہے تنگ آمد۔ ظاہر ہے کہ مسلمانانِ ہند کی کشمکش کے اگلے منظر کا عنوان بجنگ آمد ہو گا۔

ایک روز مجلسِ تعمیر کے اراکین کو مشورے اور معائنے کے لیے مینار کی بالائی منزل میں جمع ہونا تھا۔ مینار کی سیڑھیوں کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ سوچا راستہ کاٹنے کے لیے تحریک کی باتیں کرتے چلیں۔ بنیاد کی بات تو ہم چبوترے پر

ہی ختم کر چکے تھے۔ اب جو مینار پر چڑھنا شروع کیا تو پہلی سیڑھی پر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخ لکھی ہوئی تھی، ادھر قراردادِ لاہور منظور ہوئی اُدھر اُس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ مخالفوں نے ہی اُس کا نام قرار دادِ پاکستان رکھا اور خود نامزد کرنے کے باوجود یہ کہنا شروع کیا کہ پاکستان کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ لوگ ہر وضاحت کے بعد یہی جملہ دہراتے رہے یہاں تک کہ ایک اخبار نے ۱۳ اپریل ۱۹۴۷ء کو یہ خبر شائع کی کہ گاندھی جی نے کل پرارتھنا میں کہا ہے کہ میں اب تک پاکستان کا مطلب نہیں سمجھا۔ گاندھی جی کے اس رویّے کو ہم نے اُن کی مطلب براری پر محمول کیا کیونکہ پاکستان کا مطلب سمجھانے کے لیے تو مسلمانوں نے ایک نعرہ بھی وضع کر لیا تھا اور سات سال فلک شگاف نعرے سننے کے بعد مطلب پوچھنا محض ستم ظریفی تھی۔ کسی نے جواب دیا ذرا چند ہفتے توقّف کر لیں تو مطلب نقشے پر عیاں ہو جائے گا۔ گاندھی جی توقّف کے لیے پیدل نواکھلی جا نکلے۔

قرارداد کی مخالفت نے شدّت اختیار کر لی۔ ہندو مہا سبھا کے صدر ساور کر نے

اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ پاکستان ہندوؤں کے لیے خود کُشی کا مترادف ہے۔ ہندوستان کی وحدت اگر قائم رہ سکتی ہے تو ہندوؤں کی عسکری تنظیم کے بل پر اور انہی کے زورِ بازو سے۔ تقریر ختم ہوئی اور فساد شروع ہو گیا۔ چند دنوں بعد ڈاکٹر مونجے نے اعلان کیا کہ مسٹر جناح مسلمانوں کو علیحدہ قوم سمجھتے ہیں تو انہیں اپنی قوم کے ساتھ غیر ملکیوں کے سے سلوک کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اور اِس ملک سے نکل کر وہاں چلے جانا چاہیے جسے وہ اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ تقریر ختم ہوئی تو اقلیت کو صوبہ بہار کے کتنے ہی دیہات اور قصبے خالی کرنے پڑے۔ ہندو مہا سبھا کا ایک اور سالانہ اجلاس ہوا۔ اُس کی کارروائی یکم جنوری ۱۹۴۴ء کے اخبار میں یوں چھپی۔ "پاکستان کے زہر کا تریاق یہ ہے کہ ہر نو مسلم کو دوبارہ ہندو بنالیا جائے اور باقی مسلمانوں کی شدھی کر دی جائے۔ اگر یہ کام ہو گیا تو پھر پاکستان کا مطالبہ کرنے والا ہی کوئی نہ رہے گا۔" اس جملے کے بعد خبر کا ایک حصّہ جو قوسین میں درج ہے وہ ان الفاظ پر مشتمل ہے۔ "بڑے زور کی تالیاں۔" ادھر یہ زور سے تالیاں بجاتے رہے اُدھر تحریک زور پکڑتی رہی۔ جس ذہنیت نے مینارِ پاکستان کی

بنیادیں کھودی تھیں وہ اب اُس کی تعمیر اور سر فرازی میں ہمارا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ ہندوؤں نے اپنی اکثریت، سرمایہ، تجارت، تعلیم، عہدے اور اخبار بھی مخالفت میں جھونک دیے۔ ہمارے پاس اُس سارے ہنگامے میں صرف ایک آواز تھی، ایک نحیف انسان کی گرج دار آواز، اس نے کہا۔ "پاکستان قضائے الٰہی ہے اور ہندوؤں کا کوئی جوش یا واویلا اُسے آگے پیچھے نہیں کر سکتا۔ اس جوش اور واویلے کے کئی نام ہیں۔ یہ نام ہم قافیہ تو نہیں مگر ہم وزن ضرور ہیں۔ کل یہ شیر دھانند، مونجے اور ساورکر کہلاتا تھا، آج اِسے ٹنڈن اور مکھر جی کہتے ہیں۔ کل اسے مدھوک اور گوالکر کہا جائے گا۔ سچ ہی تو کہتے ہیں کہ ہندو مذہب میں آواگون برحق ہے۔

مخالفت کا ایک دُوسرا رُخ بھی تھا۔ گورا فرنگی رُخ جو کبھی حیرت سے سفید اور کبھی غصّے سے سُرخ ہو جاتا تھا۔ کرپس ۱۹۴۲ء میں ایک تجویز لے کر آئے مگر اُس کی توجیہہ جو کانگریس سے بیان کی وہ اس توضیح سے مختلف تھی جو لیگ کے سامنے کی تھی۔ ذہانت کی داد ملی مگر مشن ناکام ہو گیا۔ فضا مکدّر دیکھی تو لارڈ

ایمری نے اعلان کیا کہ متحدہ ہندوستان اب بھی ہمارا نصب العین ہے۔ ایک دن وائسرائے نے بھی اس پر گرہ لگائی کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے۔ ایک مزاح نگار نے جواب میں لکھا۔ ”خدا نے ساری دنیا کو بھی ایک ہی بنایا تھا۔ اب اگر انسانوں نے اُس دنیا میں ملک بنا لیے تو گویا جغرافیہ انسانوں نے بنایا۔ کیوں صاحب؟ پرانے انسانوں کو جغرافیہ بنانے کا کیوں حق تھا اور ہمیں وہ حق کیوں حاصل نہیں۔“ تحریک کے کارکنان نے جغرافیے کا یہ سبق سُنا اور تاریخ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن نے پاکستان کو نامناسب قرار دیا، پھر منظر پر نئے اور آخری وائسرائے تشریف لائے اور اپنے سیکرٹری سے کہنے لگے۔ مسٹر جناح مُجھ سے گفتگو کرسکتے ہیں مگر فیصلہ میرا ہی رہے گا۔ یہ ساری باتیں بڑے تحمل سے قائدِ اعظم نے سُنیں اور کہا۔

”دولتِ برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتی ہے اور گاندھی جی مسلم ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم دونوں کو اپنے پر حکومت نہ کرنے دیں گے، خواہ دونوں متحد ہو کر یا تنہا کوشش کر دیکھیں۔“

ان واقعات کو دہراتے ہوئے ہم مینار کی پہلی دو منزلوں سے آگے نکل آئے۔
مینار کی دوسری اور تیسری منزل کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ ساتھی تھک
گئے اور تھوڑی دیر کے لیے گفتگو بھی بند ہو گئی۔ ہر سیڑھی پر یہ سوال دِل میں
اُٹھتا تھا کہ کب تک یونہی چڑھتے جائیں گے۔ کیوں نہ اسی جگہ ٹھہر کر دم لے
لیں۔ اتنے میں ایک ساتھی نے سیڑھیوں کی چھت سے لٹکے ہوئے دو چار
پرندے دیکھ لیے، کہنے لگے یہ کیا ہے، عرض کیا یہ پرندا ہر مینار میں بسیرا کرتا
ہے۔ انہیں دن میں کچھ نظر نہیں آتا اور ویسے بھی اُلٹا لٹکا رہنے کی وجہ سے اُنہیں
ہر چیز اُلٹی نظر آتی ہے۔ ساتھی کہنے لگے اِن کا قصّہ چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ خود
مسلمانوں نے اس تحریک کی کتنی مخالفت کی تھی۔ میں نے کہا یہ مخالفت کا تیسرا
رُخ تھا۔ مندر اور کلیسا کے بعد کچھ مخالفت ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں سے بھی ہوئی
تھی۔ ان مسجدوں میں قوم پرست اذان تو دیتے تھے مگر وہاں جماعت اور نماز کا
کوئی انتظام نہ تھا۔ ایک قوم پرست مسلمان وزیرِ اعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے
کہ اُن کو جتنا ایمان گاندھی پر تھا اگر اسی قدر اللہ پر ہوتا تو ولی ہوتے۔ ایک اور

صوبے میں وہاں کے مسلمان وزیرِ اعظم کے بارے میں یہی بات انگریزوں کے حوالے سے کہی جاتی تھی۔ علما کا ایک قافلہ بھی راہ میں بھٹک گیا۔ شورِ ناقوس میں وہ بانگِ دراسے نا آشنا رہے۔ آزادی سے چار ماہ قبل لاہور میں کُل ہند مسلم مجلس نے اینٹی پاکستان کانفرنس منعقد کی۔ پاکستان کے قیام سے تین ماہ پہلے جمعیۃ العلما ہند کے صدر نے قائدِ اعظم کو لکھا کہ تمام مسلمان جماعتوں کا ایک جلسہ ہونا چاہیئے تاکہ یہ طے کیا جاسکے کہ مسلمانوں کا مطالبہ کیا ہے۔ قائدِ اعظم نے کہا کہ آپ لیگ میں شامل ہو جائیں مطالبہ خود بخود آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔

رشتۂ تسبیح کے ٹوٹے ہوئے دانوں میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جس کے خطیب بے مثل تھے اور قاری خوش الحان۔ لوگ رات بھر اُنہیں سُنتے اور سر دھنتے۔ صُبح ہوتی تو رات گئی رات کی بات گئی۔ کسی نے شکایت کی کہ یہ لوگ تقریریں تو ہماری سُنتے ہیں مگر بات مسلم لیگ کی مانتے ہیں۔ جواب ملا، آپ صرف آتش بیان ہیں اور لوگ کسی آتش بجاں کی تلاش میں ہیں۔

سیاسی جماعتوں کا جوش و خروش زوروں پر تھا، موت و حیات کی کشمکش جاری تھی۔

صحافت سراسر سیاست میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پھر بھی کچھ لکھنے والے ایسے تھے جو اِن ہنگاموں کے ادبی پہلو سے بھی واقف تھے۔ ہمارا ایک صحافی تھا جو غالبؔ کی طرح اپنا کام طعنوں سے نکالنے کا قائل تھا۔ گاندھی جی کی سالگرہ ہوئی تو ایک تحفہ ڈان نے بھی بھیجا۔ الطاف حسین لکھتے ہیں۔ ''مسٹر گاندھی آج اٹھتر برس کے ہو گئے ہیں۔ اپنی بار آور سیاسی زندگی میں انہوں نے عدم تشدّد کے لٹریچر کا ایک بہت بڑا انبار لگایا ہے لیکن اِس کا نتیجہ لاشوں اور شکستہ ہڈیوں کے اتنے ہی بڑے ڈھیر کی شکل میں نکلا ہے اور اب ہم متذبذب ہیں کہ آج ان کو کیونکر فسادات کی سالگرہ پر مبارکباد پیش کریں۔''

اُردُو کے دو اخبار آپس میں اُلجھ پڑتے ہیں، ایک لکھتا ہے۔

مصلحت دید من آن است کہ یاران ہمہ کار

بگذارند و خمِ طرۂ یارے گیرند

اس شعر میں جس محبوب کی طرف اشارہ ہے وہ ایک وزیرِ اعظم تھے جن کا طُرّہ

بہت بُلند ہوا کرتا تھا۔ دوسرے اخبار نے چوٹ کی۔

نہ ہر کہ طرف کُلاہ کج نہاد و تند نشست

کلاہ داری و آئین سروری داند

پہلے اخبار نے پھر لکھا۔

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز

دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

دوسرے اخبار نے اگلے ہی روز یہ شعر نذر کیا۔

با سکندر خضر در ظلمات گفت

مرگ مشکل زندگی مشکل تر است

لوگ کب تک اخبار پڑھنے پر ہی اکتفا کرتے، وہ بھی اس مکالمے میں شامل ہو

گئے۔ سول نافرمانی شروع ہوئی، وزارت ٹوٹ گئی اور ساتھ ہی یہ بیت بازی بھی ختم ہو گئی۔

کشت و خون کا ہنگامہ بپا تھا، ہر طرف آگ لگی تھی مگر لطیفے تھے کہ آئے دن فسادات کی سی باقاعدگی کے ساتھ واقع ہوتے رہتے۔ ایک لطیفہ افکار و حوادث سے نقل کرتا ہوں۔ سون سکیسر میں احرار کا جلسہ تھا۔ ایک کلہاڑی پڑی تھی، مقرّر نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اُسے اٹھا کر پاکستان کا مطلب سمجھانا شروع کیا۔ ڈنڈے کے ایک طرف بنگال اور دوسری طرف پنجاب، پھل پر ہاتھ پھیرا اور کہا یہ رہا صوبہ سرحد۔ پھل تیز تھا۔ ہاتھ پھیرتے ہی خون نکل آیا۔ کسی نے توجّہ ہٹانے کے لیے نعرہ لگایا۔ "مجلس احرار اسلام" ادھر اسٹیج سے آواز آئی، "اجی اِس پر مٹّی ڈالیے اور پٹّی باندھ دیجیے۔"

مجلس احرار کی کلہاڑی کا پھل تیز تھا مگر اِس سے بیشتر اپنوں کی ہی انگلیاں اور گردنیں کٹتی رہیں۔ یہی حال خاکساروں کے بیلچے کا تھا، اُس کی ضرب کاری تھی مگر اس کے وار بھی اپنوں کو سہنے پڑے، یہاں تک کہ جب انکساری نے زور پکڑا

تو ایک نوجوان نے قائدِ اعظم پر حملہ کر دیا۔ لیگ کا کہنا تھا کہ اُن کے پاس کلہاڑی اور بیلچے کے مُقابلے میں خنجر ہے مگر یہ دعویٰ ملّی ترانے کے مصرعے ''خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا'' تک ہی محدود تھا۔ ۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخابات میں جب مسلمان طالبِ علم ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئے اور لیگ کو شاندار کامیابی ہوئی تو ایک تقریب اسلامیہ کالج لاہور میں نوابزادہ لیاقت علی خان کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں مجاہدِ ملّت کے سرٹیفکیٹ اور کچھ تلواریں ممتاز طلبا میں تقسیم کی گئیں۔ ان میں چار تلواریں ایک ایسے شخص نے تحفے میں دی تھیں جو خود بھی تیغِ بے نیام ہوا کرتا تھا اور اب اگر ٹمپل روڈ پر نظر آجائے تو اس کے ہاتھ میں تلوار کے بجائے تسبیح ہوتی ہے اور لب پر یہ مصرعہ

آؤ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی

انتخابات میں نوجوان طلباء کی شمولیت کی بجائے خود ایک علیحدہ داستان ہے۔ طلباء نے جس بے سر و سامانی مگر جوش و جذبے سے حکومت، ہندو اور قوم پرستوں کا مقابلہ کیا اس کی مثال صرف میدانِ کارزار ہی میں مل سکتی ہے۔

باخون صد شہید مقابل نہادہ اند

عمری کہ ما بآتش افسانہ سوختیم

عرفیؔ

یہ شاداب چہرے اور یہ خندہ رو نو عمر جب درس گاہوں کی محفوظ فضا سے باہر نکلے تو کچھ دیکھنے والوں کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے انہیں ہنسی میں اُڑا دیا۔ جب یہ لڑکے ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئے اور گھر گھر اور قریہ بہ قریہ جا کر قائدِ اعظم کا پیغام پہنچایا اور لوگوں نے بھی اس پیغام پر عمل کرنا شروع کر دیا تو سب سے زیادہ حیرت اُن لوگوں کو ہوئی جنہیں وراثت میں زمینوں کے ساتھ سیاست بھی ملا کرتی تھی۔ اس حیرت کا مظاہرہ انہوں نے تشدد سے کیا۔ ایک زخمی لڑکا ہماری یونیورسٹی میں بھی پہنچا۔ اس کے سر پر پٹّی بندھی ہوئی تھی جسے دیکھ کر سب لڑکے مُشتعل ہو گئے اور سر پر کفن باندھ کر نکل آئے۔ یہ طالب علم جو بائیس برس پہلے زخمی ہوا تھا اب شارع قائدِ

اعظم پر واقع ایک فرم کا مالک ہے، ملاقات ہو تو پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ تم نے وہ پٹّی کیوں اُتار دی، ابھی تو بہت سے زخم ہرے ہیں۔

جب تحریک کو طلبا کی وجہ سے تقویت پہنچی تو بہت سے لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مسلمان طلبا کا معیارِ تعلیم گِر گیا ہے اور اُن کی اہم درس گاہیں تباہ ہو گئی ہیں۔ پنجاب کے وزیرِ تعلیم نے ایک اپیل شائع کی کہ اسلامیہ کالج لاہور کو تباہی سے بچایا جائے کیونکہ ۱۹۴۴ء میں ایم اے اور بی اے کا نتیجہ ۷۵ اور ۶۵ فیصد تھا اور ۱۹۴۶ء میں گِر کر ۴۵ اور ۳۰ فیصد رہ گیا ہے۔ اِس بیان میں صاحب موصوف نے نہ بتایا کہ مرکزی اسمبلی کے الیکشن میں لیگ کا نتیجہ ۱۰۰ فیصد رہا ہے اور اُن کے اپنے صوبے میں ۸۲ میں سے ۷۵ نشستیں لیگ نے حاصل کی ہیں۔ مُجھے یہ سابق وزیرِ تعلیم وزارت سے علیحدہ ہونے کے پندرہ سال بعد پنجند کے ریسٹ ہاؤس میں ملے۔ انہیں دیکھ کر مجھے خواجہ ناظم الدّین کا ایک خط یاد آ گیا جو میں نے طالبِ علمی کے زمانے میں دیکھا تھا۔ خواجہ صاحب نے اپنے لڑکے کو جو علی گڑھ میں پڑھتا تھا لکھا کہ تم کو چاہیے کہ تحریکِ پاکستان کے کام میں کوئی غفلت نہ ہو،

تم تو اگلے سال بھی امتحان میں بیٹھ سکتے ہو۔ مگر قوم کا ایسا امتحان ہر سال نہیں آیا کرتا۔

قوم کا وہ امتحان جس کا خواجہ صاحب نے ذکر کیا تھا اس میں بہت سے پرچے تھے اور ایک پرچے کے ممتحن ماسٹر تارا سنگھ بھی تھے۔ ۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو ماسٹر جی نے لاہور میں اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر کرپان لہرا کر پاکستان مردہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اس دن ایک جلسہ بھی ہوا جس میں ماسٹر جی نے فرمایا کہ میں نے بگل بجا دیا ہے، جاؤ اور مسلم لیگ کو ختم کر دو۔ لاہور میں اسمبلی کی انہی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ایک دن میں نے طلباء کی سلامی لی۔ سنا ہے ان دِنوں ماسٹر جی اپنی کوتاہیوں کی خود تجویز کردہ سزا کے مطابق امرتسر میں دربار صاحب کے باہر بیٹھے زائرین کی جوتیاں سیدھی کر رہے تھے۔ ماسٹر جی کو تو ہم نے عمر بھر پاپوش میں آفتاب کی کرن لگاتے ہی دیکھا ہے۔

جس امتحان کا ذکر ہو رہا ہے اُس کے کئی پرچے پنجاب حکومت نے بنائے تھے اگرچہ یہ پرچے قبل از وقت کھل گئے تھے مگر پھر بھی انہیں حل کرنے میں بڑی

دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک روز تو لوگ جلوس کی صورت میں صبح سیکریٹریٹ کے سامنے جمع ہو گئے اور آدھ گھنٹے تک گیٹ کے سامنے سڑک پر نماز پڑھتے رہے۔ اس راہ سے ہر روز کتنی ہی موٹریں سیکریٹریٹ میں داخل ہوتی ہیں مگر اُن میں بیٹھنے والوں میں کتنے ایسے ہیں جنہیں یہ یاد ہو کہ پچھلی نسل کو اس سڑک پر سجدہ کرنا پڑا تھا تاکہ موجودہ نسل اس کروفر کے ساتھ اِس دفتر میں بیٹھ کر حکومت کر سکے۔ غفلت نہ ہو تو تاریخ معاف کرتی ہے اور نہ ہی شریعت، اس لیے کیا عجب کہ آئندہ کسی نسل کو اِسی سڑک پر سجدہ سہو بھی کرنا پڑے۔

یاد رکھنے والوں اور سبق لینے والوں کے لیے تو تحریک کی تاریخ واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ جب تحریک عروج پر تھی تو لدھیانے میں ایک اٹھارہ سالہ نوجوان جس کا نام خواجہ محمد صدیق تھا پاکستان کے نام پر شہید کر دیا گیا۔ یوں تو فسادات میں بے شمار مسلمان شہید ہو چکے تھے مگر تحریک کی رعایت سے صدیق کو پاکستان کے پہلے شہید کا خطاب ملا۔ لدھیانے میں اُس کی یاد میں ایک جلسہ ہوا جس میں شمولیت کے لیے لاہور سے اس وقت کے ایک مشہور نوجوان رہنما بھی

تشریف لے گئے۔ ان کی تقریر شوکت الفاظ سے پُر تھی۔ کہنے لگے "اگر قائدِ اعظم ہم سے اِس راہ میں قربانیاں طلب کریں تو پھر ہر مومن اپنی تاریخی روایات کی عزّت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی جان قربان گاہِ عشقِ ملّت کے سپرد کر دے گا تاکہ وہاں صدیق اکیلا نہ رہے۔" صدیق اب کہاں اکیلا ہے۔ اُس کے ساتھ لاکھوں مہاجر، ہزاروں اغواشدہ عورتیں، کشمیر کے مجاہد اور جنگ ستمبر کے شہید بھی شامل ہیں۔

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست

تانہ پنداری کہ تنہامی روی

سارے راستے چڑھائی ہی چڑھائی تھی، راہ کٹھن تھی پھر بھی کٹ ہی گئی، ہم لوگ بالآخر تھکے ماندے مینارِ پاکستان کی بالائی منزل پر جا پہنچے۔ شہ نشین میں داخل ہوئے، منظر خوشنما، ہوا خنک۔ سب سے پہلے حق تعالیٰ کا شکر اُسی کے الفاظ میں یوں ادا کیا "اور وہ لوگ (غایت فرح و سُرور سے) کہیں گے اللہ کا لاکھ لاکھ

احسان ہے کہ جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا اور ہماری کبھی (یہاں تک) رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتے" (سورۃ ۷ آیت ۴۳ جزوی)۔ مجھے وہ لوگ یاد آنے لگے جو مینار کے نیچے یا سرزمینِ مینار سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ دُور رہ جانے والے نہ جانے کس حال میں ہوں گے۔ اور مینار کی سرفرازی کی قیمت نہ جانے اُن کی کتنی نسلوں کو ادا کرنی پڑے۔ جو قیمت وہ ادا کرتے ہیں، وہ ہمارے حساب میں قرضے کے طور پر لکھی جاتی ہے اور یہ قرضہ ہے کہ روز بروز بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو نیچے رہ گئے ہیں وہ تو ہمارے ساتھ چلے تھے کہ یہاں اُن کو بھی شہ نشین پر جگہ ملے گی مگر وہ ابھی تک خاک بسر ہیں۔ میں نے دل میں سوچا یہ بھی عجیب بات ہے کہ آزادی اور علیحدہ وطن کے لیے تو ہماری دعائیں صرف سات سال کی قلیل مدّت میں قبول ہو گئیں مگر کچھ اور دعائیں جو ہم نے مانگی تھیں اُن پر تو دہائیاں بیت گئیں ہیں اور درِ قبولیت ابھی تک وا نہیں ہوا۔ ان دعاؤں میں سرِ فہرست دعائے کشمیر ہے جس کے لیے اُٹھے ہوئے دو ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ جنگ بندی لائن کے اِس طرف ہے اور دوسرا اُس

طرف۔ نہ جانے کیوں اب ہماری دعاؤں میں وہ پہلا سا اثر نہیں رہا۔ دُور مزارِ اقبال سے ندا آئی۔

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست

بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بُلند بام ابھی

میں نے مینار سے نیچے کی طرف نگاہ ڈالی، ہر شے اس بلندی سے پست نظر آئی۔ بڑے بڑے لوگ یہاں سے بہت چھوٹے نظر آئے۔

ایک رہنما کی یاد آئی۔ جوان، شعلہ رو اور شعلہ بیان۔ ہم نے انہیں سر آنکھوں پر رکھا، جلسے کرائے، جلوس نکالے، تقریریں سُنیں، تعریفیں کیں۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب ان کے ساتھ گروپ فوٹو کا اہتمام ہوا۔ اس تصویر کی ایک کاپی پر ہم نے اپنے جذبات کو اسماء صفات میں ڈھالا اور اسٹیشن پر جا کر وہ کاپی اُن کی نذر کی۔ تحسین اور تلقین سے نوازے گئے، پھر انہوں نے ایک جملہ میری آٹو گراف بُک پر لکھ دیا۔ کل یہ تحریک تاریخ بن جائے گی۔ پھر یہ دستخط نایاب

ہوں گے۔ یہ نشہ اُس روز سے آج تک باقی ہے اور اُسے تو وہ ترشی بھی نہ اُتار سکی جو کچھ عرصہ پہلے ایک واقعہ سے پیدا ہوئی۔ چند ماہ ہوئے یہی صاحب مجھے ملنے آئے، مدعا بیان کیا، کچھ دنیاداری اور کچھ دُکانداری۔ خرد نے جنوں کو چڑایا، یہی ہیں وہ لوگ جن کی یادوں کے نقوش آپ دل کے ساتھ لگائے رکھتے ہیں۔ جنوں نے کہا، یہ وہ شخص نہیں ہے یہ تو اُس کا سایہ ہے۔ یہ بھلا کہاں ضروری ہے کہ بڑا آدمی تمام عمر بڑا ہی رہے۔ بعض آدمیوں کی زندگی میں بڑائی کا صرف ایک دن آتا ہے اور اُس دن کے ڈھلنے کے بعد ممکن ہے کہ ان کی باقی زندگی اس بڑائی کی نفی میں ہی بسر ہو جائے۔ بدی اور نیکی کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ ایک قدم پیچھے ہٹ جائیں تو تنگِ کائنات اور ایک قدم آگے بڑھا لیں تو اشرف المخلوقات۔ درمیان میں ٹھہر جائیں تو محض ہجومِ آبادی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بعض لوگوں نے یہ قدم پیچھے کی جانب اُٹھایا تھا۔ تاریخ آگے بڑھ رہی تھی اور تاریخ ساز پیچھے ہٹ رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ مالِ غنیمت مُفت ملا تھا مگر یہ شے بازارِ زندگی میں سب سے گراں نکلی۔ جن کے سامنے غنیم نہ ٹھہر سکا۔ وہ خود

مالِ غنیمت کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ یہ مالِ غنیمت ہی تو تھا جس کی وجہ سے غزوۂ بدر کے بعد خُدا کی طرف سے تہدید نازل ہوئی تھی۔ خود ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مالِ غنیمت کے مُقابلے میں کتنے ہی ستارے ڈوبے، سورج گہنائے، بُت گرے اور مینار بیٹھ گئے۔

بسا اوقات مجھے وہ شخص یاد آتا ہے جو ایک نو آبادی کی آزادی کے لیے بہادری سے لڑا اور اس کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی۔ وہ قومی ہیرو بن گیا مگر جنگ طویل تھی اور جاری رہی۔ یہی ہیرو اس اثنا میں ایسا بدلا کہ دوسری طرف جا ملا اور ملک کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ جنگ نَو آبادی نے جیت لی۔ اب قومی ہیرو کے صحیح مقام کے تعیّن کا سوال اُٹھا۔ طے پایا کہ اس کا ایک مجسمہ نصب کیا جائے۔ مگر وہ صرف ایک ٹانگ پر مشتمل ہو جو آزادی کی راہ میں کٹی تھی۔ ایک ٹانگ کا یہ مجسمہ عبرت کا بہت بڑا سبق ہے۔ اگر پاکستان میں مجسمہ سازی جائز ہوتی اور تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں مجسمے بنائے اور کہیں نصب کئے جاتے تو اُس جگہ پر علم الاعضا کے عجائب گھر کا گمان گزرتا۔ ایک فردِ واحد کے علاوہ کسی اور کا بُت وقت

کے ہاتھوں سلامت نہ رہتا۔ اس فردِ واحد کو یاد کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ عقیدہ عمارت سے پائیدار ہوتا ہے اور انسان مینار سے کہیں زیادہ قد آور ہوتا ہے۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی

مگر بنائے محبّت کہ خالی از خلل است

ایک بندر گاہ پر فوجی بینڈ بج رہا تھا۔ دُھن غمگین تھی اور سُر مدھم تھا۔ برطانوی سپاہی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے جہاز میں چڑھنے لگے۔ جہاز نے لنگر اُٹھایا، تاریخ نے ورق اُلٹا، نئے صفحے پر جلّی حروف سے لکھا ہوا تھا۔ وتزع الملک ممن تشاء اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں۔

پاکستان کی مجلسِ آئین ساز کا اجلاس تھا۔ ملک معظّم کا نمائندہ کہہ رہا تھا، آج میں آپ کے وائسرائے کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں۔ کل سے مملکتِ پاکستان آپ کے ہاتھوں میں ہو گی۔ غیب سے ندا آئی۔ ملک الملک توفی الملک من تشاء۔ مالک الملک تو ہی دیتا ہے ملک جس کو چاہے۔

میں نے یہ آیت سُنی تو آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ میں نے مینارِ پاکستان کی رفعت سے اُفق پر نگاہ ڈالی، مجھے چاٹگام کا ساحل اور سلہٹ کے پہاڑ نظر آئے۔ اب مجھے مینار کی عظمت کا احساس ہونے لگا۔ دل نے کہا، آج مطلع صاف ہے اور نظر دور تک جاتی ہے اگر غبار آلود ہوا تو شاید تمہیں اِس مینار سے لاہور کا شہر بھی دھندلا دکھائی دے گا۔ میں نے پوچھا، مطلع صاف رکھنے کا نسخہ کیا ہے؟ جواب ملا تمہیں یہ سوال زیب نہیں دیتا۔ تمہارے پاس تو کیمیا بھی ہے اور نسخۂ کیمیا بھی۔

بات کہاں سے چلی اور کہاں جا نکلی، اب بس کرتا ہوں۔

حسن این قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

۱۹۶۸ء

قحط الرّجال

قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرّجال میں زندگی۔ مرگ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیاتِ بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرّجال۔ ایک عالم موت کی ناحق زحمت کا دوسرا زندگی کی ناحق تہمت کا۔ ایک سال حشر کا دوسرا محض حشرات الارض کا۔ زندگی کے تعاقب میں رہنے والے قحط سے زیادہ قحط الرّجال کا غم کھاتے ہیں۔

بستی، گھر اور زبان خاموش۔ درخت، جھاڑ اور چہرے مُرجھائے۔ مٹّی، موسم اور لب خشک۔ ندی، نہر اور حلق سوکھے۔ جہاں پانی موجیں مارتا تھا وہاں خاک اُڑنے لگی، جہاں سے مینہ برستا تھا وہاں سے آگ برسنے لگی۔ لوگ پہلے نڈھال ہوئے پھر بے حال۔ آبادیاں اُجڑ گئیں اور ویرانے بس گئے۔ زندگی نے یہ منظر

دیکھا تو کہیں دور نکل گئی، نہ کسی کو اُس کا یارا تھا نہ کسی کو اُس کا سُراغ۔ یہ قحط میں زمین کا حال تھا۔

ابر دل کھول کر برسا، چھوٹے چھوٹے دریاؤں میں بھی پانی چڑھ آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا جل تھل ہوا کہ سبھی تر دامن ہو گئے۔ دولت کا سیلاب آیا اور قناعت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ علم و دانش دریا بُرد ہوئے اور ہوش و خِرد مئے ناب میں غرق۔ دِن ہوا و ہوس میں کٹنے لگا اور رات ناؤ نوش میں۔ دِن کی روشنی اتنی تیز تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں، رات کا شور اتنا بُلند تھا کہ ہر آواز اُس میں ڈوب گئی۔ کارواں نے راہ میں ہی رختِ سفر کھول دیا۔ لوگ شاد باد کے ترانے گانے لگے، گرچہ منزل مراد ابھی بہت دور تھی۔ زندگی نے یہ منظر دیکھا تو کہیں دُور نکل گئی، نہ کسی کو اُس کا یارا تھا نہ کسی کو اُس کا سُراغ۔ یہ قحط الرّجال میں اہلِ زمین کا حال تھا۔ شاعر نے جو یہ حال دیکھا تو نوحہ لکھا۔

بے دِلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق

بے کسی ہائے تمنّا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

دل گرفتگی نے کہا ایسی شادابی اس ویرانی پر قربان جہاں مادرِ ایّام کی ساری دخترانِ آلام موجود ہوں مگر وبائے قحط الرّجال نہ ہو۔ اس وبا میں آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ مردم شماری ہو تو بے شمار، مردم شناسی ہو تو نایاب، دل کی خاطر مجھے منظور تھی کہ اس کو آزردہ رکھنا کفر ہے۔ اس کی کشادگی کے بہت سے طریق ہیں جو موقع کی مناسبت سے اختیار کرتا ہوں۔ مُجھے یاد آیا کہ دل جوئی کے لئے ایک بادشاہ چھُپ کر اپنی پرانی پوستین سر آنکھوں سے لگاتا تھا۔ ہر شخص کے پاس اُس کی پوستین ہوتی ہے مگر اکثر اُس سے منکر ہو جاتے ہیں کیونکہ اُسے قبول کرنے کے لیے جس جرأت کی ضرورت ہوتی ہے اُس کی کمیابی قحط الرّجال کی پہلی نشانی ہے۔ خود فراموشی کے فریب سے بچنے کے لیے پوستین ہمیشہ سنبھال کر رکھنی چاہیے اور جب دل تنگ ہو جائے یا سنگ بن جائے تو اُس سے کشادگی اور گداختگی مُستعار لینی چاہیئے۔ میرے پاس سر و چشم پر رکھنے کے لیے چند چیزیں ہیں جو میں نے ایک بے رنگ آہنی صندوقچی میں رکھی ہوئی ہیں۔ پرائمری سکول میں یہ

میرا بستہ ہوا کرتا تھا۔ اب اِس سے بہت سے کام لیتا ہوں۔ یہ کبھی پوستین ہے، کبھی چراغ اور کبھی جام ہے۔ میں اِس کی رعایت سے کبھی سبکتگین بن جاتا ہوں، کبھی الہ دین اور کبھی جمشید یعنی کبھی خود شناس، کبھی دم بخود اور کبھی خُود مختار۔ میرے اس بستے میں تحریروں، تصویروں اور تمغوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی البم بھی رکھی ہوئی ہے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے، میں مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میں پانچویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ والدِ محترم نے فرمایا کہ آج ایک چینی مسلمان عالم ہمارے گھر چائے پر آئے گا۔ مُجھے چاہئے کہ اُس سے مِلوں اور اُس کے آٹو گراف حاصل کروں۔ مہمان کی آمد کی وجہ سے گھر میں سب مصروف تھے مگر اِس تجویز کے بعد میری مصروفیت دوسروں سے کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ نہ میرے پاس آٹو گراف البم تھی نہ آٹو گراف حاصل کرنے کا تجربہ۔ میں اِس کے آداب سے بالکل ناواقف تھا اور واقفیت حاصل کرنے کے لیے صرف دو گھنٹے ملے تھے۔ میں بازار گیا۔ ورما فوٹو گرافر کے یہاں بہت سے البم پڑے تھے۔ مجھے نیلے رنگ کی یہ

چھوٹی سی آٹو گراف البم پسند آئی جس میں مختلف رنگوں کے صفحات لگے ہوئے تھے اور جلد پر البم کا لفظ سنہرا چھپا ہوا تھا۔ اُس کی قیمت صرف چھ آنے تھی۔ اُس وقت بھی وہ البم مُجھے قیمتی لگی اور میں آج بھی اُسے بیش قیمت سمجھتا ہوں، البتّہ اُن دِنوں وجہ کچھ اور تھی اور اِن دِنوں کچھ اور۔ سہ پہر جب میں نے نامانوس خال و خط کے مہمان کے سامنے اُسے پیش کیا تو بڑی مانوس مُسکراہٹ اور شفقت سے انہوں نے میری طرف دیکھا، کُچھ باتیں ابّا جان سے کیں اور قلم ہاتھ میں لے کر چینی زبان میں تین سطریں لکھیں، پھر اُن کا لفظی ترجمہ انگریزی میں کر دیا اور دستخط کر کے البم مجھے واپس کر دی۔ میں بہت خوش ہوا حالانکہ نہ چینی سمجھ میں آئی نہ انگریزی۔ ہر اچھے آدمی کے گرد ایک ہالہ ہوتا ہے، اُس کے نزدیک جائیں تو دل خود بخود منوّر ہو جاتا ہے۔ آج میں روشنی کے اُس حلقے میں پہلی بار داخل ہوا، اپنے اندھیرے چھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ یہ خوشی کے ساتھ تعجّب کی بات بھی تھی۔ اُس چینی پروفیسر نے چینی زبان میں لکھنا شروع کیا تو مُجھے حیرت ہوئی کہ سطر میں اُوپر سے نیچے کی طرف آتی ہیں۔ حیرت اس وقت دور

ہوئی جب یہ سمجھ آیا کہ ہر اچھی بات الہامی ہوتی ہے اور الہام نازل ہوا کرتا ہے۔ معزّز مہمان نے چینی زبان میں میری البم میں جو کُچھ لکھا تھا اس کی قدر و قیمت مجھے بہت دِنوں کے بعد معلوم ہوئی اور یہ بہت سے دِن میں نے ایک تلاش میں صرف کئے ہیں۔

محمد ابراہیم شاکیو چن تو دستخط کرنے اور چائے پینے کے بعد رُخصت ہو گئے، وہ ایک طویل سفر پر نکلے ہوئے تھے اور اُن کے دستخط کی بدولت میں بھی ایک طویل سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ میرا یہ سفر آج بھی جاری ہے۔ شروع میں یہ بات بڑی آسان لگی کہ کسی بڑے آدمی کے دستخط حاصل کیے جائیں مگر جونہی میں نے دوسرا ورق اُلٹا اور سوچنے لگا کہ اب کِس کے آٹو گراف لیے جائیں تو بات ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے والد محترم سے رہنمائی چاہی تو ہدایت ملی کہ آٹو گراف البم کے صفحات ہوں یا زندگی کا ورقِ سادہ، انہیں یونہی نہیں بھرنا چاہیے۔ جاؤ نگہِ انتخاب کو کام میں لاؤ، بڑے آدمی زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ ان سے تعارف کے لیے کارلائل سے مدد مانگو، اُن سے ملاقات کے لیے

پلوٹارک کے پاس جاؤ۔ اُن کو سمجھنے کے لیے سعدی سے لے کر سیموئل سائل تک سب کے دروازے پر دستک دو۔ راہ کا نشان اتنا واضح ملا تو سفر شروع ہو گیا۔ پہلی منزل نہ عظیم مصنّف تھے نہ ضخیم کتابیں، یہ سفر تو بچّوں کی کہانیوں کی چھوٹی سی پگڈنڈی پر شروع ہوا۔ اسکول میں انعام تقسیم ہوئے تو ایک کتاب جس کا عنوان بہادر لڑکا تھا میرے حصّے میں آئی۔ یہ ایک ولندیزی بچّے کی کہانی تھی جو سرما کی ایک شام سمندری پُشتے پر جارہا تھا کہ اُس کی نظر ایک چھوٹے سے سوراخ پر پڑی۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ گاؤں جاکر اُس کی خبر کرے گا تو اتنی دیر میں پانی کے زور سے پُشتے میں شگاف ہو جائے گا اور پھر وہ ساری بستیاں اور وہ سارے کھیت جو سطحِ سمندر سے نیچے ہیں غرق ہو جائیں گے۔ وہ اُس سوراخ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ رات آئی تو وہ اُسی حالت میں سو گیا۔ پہلے سردی اور پھر موت سے اُس کا جسم اکڑ گیا مگر ننھا سا ہاتھ جوں کا توں پُشتے کے چھوٹے سے سوراخ پر رکھا رہا۔ صُبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ اُن کا محسن ایک بہادر لڑکا ہے۔ میرے سفر کی یہ پہلی منزل تھی۔ اُس کا نقش دوسری ساری منزلوں سے گہرا اور روشن ہے۔ یہ منزل

جرأت اور قربانی کی منزل تھی، اُس کے بہت سے نام ہیں اور وہ نام جس سے اس کی ساری عظمتیں عیاں ہوتی ہیں شہادت کہلاتا ہے۔

بہادر لڑکے کی کہانی بچّوں کے لیے تھی اور ایک بچّے نے اُسے پڑھا تھا۔ وہ بچّہ یہ سمجھا کہ جرأت کے اظہار کے لیے جو مقامات درکار ہیں وہ صرف دوسرے ملکوں میں ہوا کرتے ہیں جیسے ہالینڈ میں سمندر کو روکنے والے پُشتے، وقت گزرا تو یہ عقدہ کھُلا کہ دنیا کا ہر ملک سطحِ سمندر سے نیچے آباد ہے۔ آبادی اور سمندر کے درمیان پُشتے بنے ہوئے ہیں، نئے اور پرانے، پائیدار اور ناپائیدار۔ ان میں جو پُشتے دین اور سیاست کے ریختہ اور بدن کے لہو اور قلم کی سیاہی کے آمیختہ سے بنے ہوں اور جن کی حفاظت بصیرت اور فکرِ فردا کے سپرد ہو صرف وہی پُشتے مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں۔ پُشتے خواہ کتنے ہی پائیدار کیوں نہ ہوں اُن کی حفاظت پشت در پشت اور لمحہ بہ لمحہ کرنی پڑتی ہے۔ اگر اُن میں چھوٹا سا سوراخ ہو جائے تو اُسے شگاف بنتے دیر نہیں لگتی۔ سوراخ بند کرنے کی ترکیب بہادر لڑکے کی کہانی میں درج تھی اور شگاف کی تباہیوں کا حال تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ تاریخ کو غور

سے پڑھا تو وہ پُشتوں اور شگافوں کی داستان نکلی، ایک ورق سبق عزم و ہمّت اور دوسرا ورق درس عبرت۔ پُشتے کے بارے میں تاریخ کہتی ہے کہ مضبوط ہو تو سمندر کو روکنے والی چٹان اور نازک ہو تو چینی کا بیش بہا گُلدان۔ گُلدان کی داستان بھی سُن لیں۔ کہتے ہیں ایک خاندان میں چینی کا ایک قیمتی اور قدیمی گُلدان ہوا کرتا تھا۔ ایک لا اُبالی نوجوان نے بوڑھے جد سے اُس کی اہمیت کے بارے میں پوچھا، جواب ملا کہ وہ کئی نسلوں سے خاندان میں سب سے قیمتی ورثہ کی حیثیت سے محفوظ چلا آ رہا ہے اور خاندان کے ہر فرد اور ہر نسل کا فرض ہے کہ اُس کی حفاظت کرے۔ نوجوان نے کہا، اب اِس کی حفاظت کا تردّد ختم ہوا کیونکہ چینی کا وہ گُلدان موجود نسل کے ہاتھ سے پھسل کر فرش پر ِگرا اور چکنا چور ہو گیا۔ بوڑھا بولا، حفاظت کا تردّد ختم ہوا ندامت کا دَور کبھی ختم نہ ہو گا۔

جرأت کی طرح قربانی کے بارے میں بھی پہلے غَلَط فہمی ہوئی۔ خیال تھا کہ یہ گذرے ہوئے زمانے میں کسی زرہ پوش اور کفن بر دوش جذبے کا نام تھا اور اُس زمانے میں جنگ کے لیے ڈھال، تلوار اور یہ جذبہ کام آتا تھا، اب چونکہ ڈھال

اور تلوار کا زمانہ نہیں رہا اس لیے قربانی کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جنگ کے بارے میں بھی میری واقفیت واجبی تھی۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ جنگ صرف پہلے زمانے میں ہوتی تھی جب آدمی غیر مہذّب اور بہادر تھا اور اب اس کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ آدمی مہذّب اور بُزدل ہو گیا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کا ذِکر کان میں پڑا تو خیال میں صرف اِتنی ترمیم ہوئی کہ اگر موجودہ دور میں بھی جنگ کا کوئی وجود ہے تو وہ دُور دراز کے علاقوں میں ہو گا اور ہمارے علاقے کے بارے میں راوی جب بھی لکھے گا چین لکھے گا۔ وقت گذرا تو یہ غلط فہمی بھی دُور ہوئی۔ معلوم ہوا کہ جنگ تو ہر وقت اور ہر جگہ جاری ہے اور اِس کے وار سے نہ کوئی خطّہ خالی ہے اور نہ کوئی لحظہ فارغ۔ اس جنگ میں ہر قدم پر قربانی دینی پڑتی ہے اور اُس کی بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ انتہائی صورت شہادت ہے مگر بعض لوگوں کی قسمت میں ایسی زندگی لکھی جاتی ہے کہ وہ جیتے جی شہیدِ ناز ہو جاتے ہیں۔ اس قبیلہ کے لوگ زندہ شہید کا درجہ رکھتے ہیں اور اُن کے امام کا نام احمد بن حنبلؒ ہے۔ مامون کے عہد میں امام حنبل کی مشکیں کسی گئیں۔ معتصم

کے عہد میں انہیں کوڑے مار کر بے ہوش کرتے اور تلوار کی نوک چبھو کر ہوش میں لاتے۔ واثق کا عہد آیا تو اُنہیں قیدِ تنہائی کی سزا ملی۔ پیرانہ سالی آئی تو ابتلا کی جگہ اُس احترام نے لے لی جو ہزار برس گذرنے کے باوجود لوگوں کے دِلوں میں تازہ ہے۔ قیامت آئے گی تو کیا عجب کہ جہاں پیشانی سجدے کے نشان سے منوّر ہو گی وہاں پشت دُرّوں کے نشان سے روشن تر ہو جائے۔ وہ پُشت جسے بعض حاکم دُرّے لگانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اِس پر لوگ خوشی سے کئی نسلوں اور کئی صدیوں کا بوجھ اُٹھا لیتے ہیں۔ دراصل جرأت کی ایک کیفیت ہے اور قربانی اس کیفیّت پر گواہی ہے۔ جرأت ایک طرزِ اختیار کا نام ہے اور قربانی ایک طریقِ ترک کو کہتے ہیں۔ اس ترک و اختیار میں بسر ہو جائے تو زندگی جہاد اور موت شہادت کا نام پاتی ہے۔

بچّوں کی کہانیوں سے بات آگے بڑھی تو لڑکوں کی اُن کتابوں تک جا پہنچی جِن میں بڑے آدمیوں کا مختصر حال درج ہوتا ہے۔ اِن کتابوں میں زیادہ تر اُن لوگوں کا ذکر تھا جن کی ایجاد و دریافت یا تحریر و افکار کو صدقۂ جاریہ کا درجہ حاصل ہے۔ یہ

ایک طویل قطار ہے، ازل سے ابد کی طرف رواں، جس میں ہر مکاں و زماں کے لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ اِس سلسلے کے دونوں سِرے کسی کو ڈھونڈے سے نہیں ملتے، ایک سِرا ماضی میں گُم اور دوسرا مُستقبل میں پوشیدہ۔ جس مقام کو حال کہتے ہیں وہاں ایک بھیڑ لگی ہے، کوئی چاند پر چڑھ رہا ہے تو کوئی قلب بیمار کی گہرائیوں میں اُتر رہا ہے۔ اِس بھیڑ میں سب کے چہرے شناخت کرنا یا سب کے نام یاد رکھنا مُشکل ہے۔ یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ اِن کو اِس بات سے ہرگز کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ یاد رکھے جائیں گے یا بھُلا دیے جائیں گے۔ غرض ہے تو صرف یہ کہ اس بے ڈھب دنیا کو کیونکر ڈھب پر لایا جا سکتا ہے۔ اِن میں سے ہر شخص نے دنیا کو جس حال میں پایا اُس سے بہتر حال میں چھوڑا اور یہی بات اُنہیں عام آدمی سے مُمتاز کرتی ہے۔ یہ لوگ فرہاد کے قبیلے سے تعلّق رکھتے ہیں۔ اِن کی ساری عُمر پہاڑ کھودتے اور نہر نکالتے گذر جاتی ہے۔ اِس نفسا نفسی کی دنیا میں جہاں ہر شخص صرف اپنے لیے زندہ ہے یہ فرہادی گروہ دوسروں کے لیے زندگی لُٹا دیتا ہے۔ یہ لوگ دنیا بھر کی مُصیبتیں نقدِ حیات کے عوض خرید لیتے

ہیں اور پھر بھی اِس سودے میں اُنہیں خسارہ نہیں ہوتا، یہ گروہ نہ ہوتا تو دنیا غیر آباد ہوتی اور یہ گروہ ناپید نہ ہوا تو انسان ماورا میں بھی ایک نئی دنیا آباد کرے گا۔ اِس گروہ کے افراد مختلف زبانیں بولتے ہیں مگر اِن کا ترانہ فارسی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ اس کے تین شعر مجھے یاد ہیں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

سفّال آفریدی، ایاغ آفریدم

بیابان و کُہسار وراغ آفریدی

خیابان و گُلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہرِ نوشینہ سازم

اقبال نے جب اِس ترانے کی بازگشت سُنی تو اُس نے جانا۔

کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

افریقہ کے گھنے جنگلوں میں ایک شخص زندگی کے معنی تلاش کر رہا تھا۔ مغربی ساحل کے وسطی جنگل میں اس کی کشتی ایک ایسے مقام پر پہنچی جہاں پانی پایاب تھا اور مگرمچھ اس کثرت سے تھے کہ کشتی اُن سے ٹکرائے بغیر ذرا بھی آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔ سُست رو پانی میں سست مگر تُند خُو جانوروں کے درمیان گھِری ہوئی کشتی میں بیٹھا ہوا فلسفی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ اس فکر میں غرق تھا کہ زندگی کو کیونکر ایک حقیر مجبوری سے ایک بیش بہا قوّت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی زبان جرمن تھی، اگر اُردُو ہوتی تو وہ یہ شعر ضرور پڑھتا۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اچانک فلسفی کے مبہم احساس کو ایک واضح خیال کی شکل مل گئی۔ ایک نا قابلِ بیان کیفیّت کو بالآخر ایک جملے نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ فلسفی کی سوچ کا

حاصل یہ تھا کہ زندگی ایک عطیہ ہے جس کا کم از کم حق ادا کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ دوسروں کو اِس میں حصّہ دار بنالیا جائے۔ فلسفی اپنی تلاش کی اس منزل پر پہنچ کر بہت خوش ہوا۔ عین ممکن تھا کہ وہ دریا میں چھلانگ لگا دیتا کیونکہ سوچنے والے ایسے کام کرتے آئے ہیں۔ وہ بھی تو ایک مفکّر تھا جو غُسل خانے سے سیدھا بازاروں میں جانکلا، خود برہنہ تھا مگر سرخوش کہ اُس کے ایک خیال کو لباس میسر آگیا ہے۔

بچّوں کی کہانیوں میں مجھے جرأت اور قربانی کا نشان ملا اور لڑکوں کی کتابوں سے مُجھے حکمت اور خدمت کا پتہ چلا۔ پہلے گروہ کے لوگ شہید کہلاتے ہیں اور اُس دوسرے گروہ میں جو لوگ شامل ہیں انہیں محسنین کہا جاتا ہے۔ اہلِ شہادت اور اہلِ احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسروں کے لیے جان دیتا ہے اور محسن دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے اور دوسرے کا تحفہ زندگی۔ ایک سے مُمکن وجود میں آتا ہے اور دوسرے سے اس وجود کو توانائی ملتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہوتا ہے جو اِس توانا وجود کو تابندگی

بخشتا ہے۔ جو لوگ اِس آخری گروہ میں شامل ہوتے ہیں انہیں اہلِ جمال کہتے ہیں۔ اہلِ جمال کی پہچان یہ ہے کہ یہ لوگ مسجد قرطبہ تعمیر بھی کرتے ہیں اور تحریر بھی۔ یہ الحکم کی طرح بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں اور اقبال کی طرح درویش بھی۔ انہیں تخلیقِ حُسن پر مامور کیا جاتا ہے۔ نثر ہو کہ شعر، نقش ہو کہ نغمہ، رنگ ہو کہ خشت وسنگ، یہ خونِ جگر سے اُسے یوں تمام کرتے ہیں کہ جو نظر اِن کی تخلیق پر پڑتی ہے وہ روشن ہو جاتی ہے، اگر اِن کی تخلیق میں حُسنِ صورت ہے تو خود اِن کی اپنی ذات میں بھی ایک حُسن ہوتا ہے جسے حُسنِ سیرت کہتے ہیں۔ حُسن کی دولت اہلِ جمال کو اتنی وافر ملتی ہے کہ وہ اسے دوسروں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ تقسیم اِن کی زندگی کے بعد بھی جاری رہتی ہے اور اِس کی بدولت بدی اور بد نمائی کو پھلنے پھُولنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

زندگی کو ایک گروہ نے ممکن بنایا، دوسرے نے توانا اور تیسرے نے تابندہ۔ جہاں یہ تینوں گروہ موجود ہوں وہاں زندگی موت کی دسترس سے محفوظ ہو جاتی ہے اور جس ملک یا عہد کو یہ گروہ میسّر نہ آئیں، اُسے موت سے پہلے بھی کئی بار

مرنا پڑتا ہے۔ جس سرحد کو اہلِ شہادت میسر نہ آئیں وہ مِٹ جاتی ہے۔ جِس آبادی میں اہلِ احسان نہ ہوں اُسے خانہ جنگی اور خانہ بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس تمدّن کو اہلِ جمال کی خدمات حاصل نہ ہوں وہ خوشنما اور دیرپا نہیں ہوتا۔

میری تلاش مُجھے اہلِ شہادت، اہلِ احسان اور اہلِ جمال تک لے آئی تو مُجھے سند کی فکر ہونے لگی۔ سند کی دُور دُور تلاش کی مگر جب وہ ملی تو شہ رگ سے بھی قریب نکلی۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتٌۢ ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ وَلَـٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (۲:۱۵۴) اور اے مسلمانوں! جو شخص خدا کی راہ (حق) میں (جدوجہد کرتا ہوا) مارا گیا، اُسے مُردہ نہ کہو، بلکہ وہ تو زندہ ہے لیکن افسوس کہ تُم اِس حقیقت کو نہیں جانتے۔

یہ سند اہلِ شہادت کے بارے میں ہے۔ اِن لوگوں کا ذکر قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، اِن کے زندہ ہونے، روزی پانے اور اجرِ عظیم کا حق دار ہونے کے علاوہ یہ بھی آیا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو رحمت اور مغفرت اِن کے حصّے میں آئے گی

وہ اِن تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کا ذخیرہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ اہلِ احسان کا ذکر بھی کئی جگہ آیا ہے اور اُن کے لیے بھی نوید ہے۔ ایک طرف تو یہ وعدہ ہے کہ سَنَزِيدُ ٱلْمُحْسِنِينَ (۱۶۱/۷) یعنی اُن کو اور زیادہ دیں گے، اور دوسری طرف بشارت ہے کہ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ (۳/۱۴۸، ۴/۱۳۴) اور إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ (۲/۱۹۵) خُدا کی محبّت جو اہلِ احسان کو ملی اس میں اہلِ جمال بھی شامل ہیں۔ سند کے لیے یہ الفاظ غور طلب ہیں، اللهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمالَ۔

اسناد پر غور کیا تو کتنی ہی نئی راہیں کھُل گئیں۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ خُدا اپنی صفات میں انسان کو شامل کرتا ہے اور اس کی زندگی کے سفر میں بھی اُس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ اُس کا سب سے بڑا تحفہ وہ حکمت ہے جو خدا اور کتاب دونوں کی صفات میں پائی جاتی ہے۔ عزیز الحکیم نے کتاب الحکیم میں فرمایا ہے يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جِس کو دانائی ملی بے شک اُس کو بڑی نعمت

ملی۔

اس نعمت کے کئی نام ہیں۔ اہلِ شہادت کو حکمت ملی تو جنوں کہلائی، اہلِ احسان کو ملی تو خیرِ کثیر ہو گئی، اہلِ جمال تک پہنچی تو حُسن بن گئی۔ یہ تینوں گروہ اس نقطے پر آ کر مل جاتے ہیں اور پھر یہ پہچان دشوار ہو جاتی ہے کہ کون کِس گروہ سے تعلّق رکھتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر تخصیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ صفت سب کی ایک ہوتی ہے اگرچہ اظہار کی صورت مختلف ہوتی ہے۔ اس صفت کو صوفی نے تجلّی کہا اور شاعر نے عکسِ رخِ یار۔ یہ عکس حضرت لُوطؑ کے حکم و علم اور طالوت کے علم و جسم میں نظر آتا ہے۔ یہ عکس حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ پر اس وقت پڑا جب وہ ایک کھیتی کا مقدمہ فیصل کرنے لگے، وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۙ اور ہم ان کے فیصلے کے وقت موجود تھے۔ یہی عکس بیت الرضوان کے وقت اس طرح جلوہ گر ہوا، يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ خُدا کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے۔ خدا کا ہاتھ ہاتھ میں آ جائے تو انسان اپنی ذات کے درجۂ کمال تک پہنچ جاتا ہے اس درجے تک پہنچے ہوئے لوگ مومن ہوتے ہیں اور ان کا بیان

اقبال نے یوں کیا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

خدا اور مومن کے درمیان جو مقام آتا ہے اس پر پیغمبر فائز ہوتے ہیں۔ پیغمبروں کے بارے میں پہلا گمان تو یہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی دوسری مخلوق ہے اور انسان سے اُن کا تعلّق صرف یہ ہے کہ وہ کُچھ عرصے کے لیے اس روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ خاتم الانبیاء نے انا بشر فرما کر اس گمان کو باطل کر دیا اور اس بات کو حق ثابت کر دیا کہ اللہ نے بنی آدم کو عزّت دی ہے۔ بشر کی ساخت کا سوال اُٹھا تو جواب ملا کہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا ہے اور اِس جواب کے ساتھ انجیر، زیتون، طور سینین اور شہرِ امن کا ذکر بھی آیا ہے۔ انسان کی اپنی ساخت کی نوعیت اور اِس کے لیے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی بشریت سے واقف ہونے کے بعد تلاش کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ بات بہادر لڑکے کی کہانی سے چلی اور بڑے آدمیوں کی سوانح سے ہوتی ہوئی قصص الانبیاء تک جا پہنچی۔ متلاشی کو پتہ چلا کہ پیغمبر کی عظمت اس پیغام کا پرتو ہوتی ہے جو وہ لے کر آتا ہے۔ ہر ایک

پیغمبر کو علیحدہ علیحدہ تجربات سے گزرنا پڑا اور ان تجربات کی نوعیت کے اعتبار سے اُن کی مختلف صفّات کو نمایاں ہونے کا موقع ملا، یہاں تک کہ وہ اپنی امتیازی صفّات کے ساتھ یوں متصف ہو گئے کہ عام طور پر نگاہ صرف اسی معروف پہلو تک جا کر رُک جاتی ہے مثلاً صدقِ خلیل، ذبحِ اسماعیل، حُسنِ یوسف، لحنِ داؤد، ضربِ کلیم اور اعجاز، مسیحا۔ اِن تمام پیغمبروں میں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے وہ خوبیاں مشترکہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی زندگی دوسروں کی خدمت، رہنمائی اور اصلاح میں بسر ہوئی اور دوسرے اُن کی طبیعت کا وہ اِستقلال جس کی وجہ سے وہ نہ تو ناکامی میں متزلزل ہوئے اور نہ کامیابی میں متکبّر۔ یہ زندگیاں پامردی اور بے لوثی سے دوسروں کے لیے وقف رہیں۔ یہی ان کی عظمت کا راز ہے اور یہی اُن زندگیوں سے حاصل ہونے والا سب سے بڑا سبق ہے۔ پیغمبروں کی عظمت مسلّم ہے مگر فضیلت کے اعتبار سے اُن میں بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ معاملہ درجات کا ہے اور اللہ کے یہاں عام لوگوں کے علاوہ پیغمبروں کے بھی مختلف درجہ ہوتے ہیں۔ سب سے افضل مقام کا سب سے اعلیٰ

درجہ معراج کہلاتا ہے جس کو یہ مرتبہ حاصل ہوا وہ انسانوں میں سیّد البشر اور پیغمبروں میں سردار الانبیاء کہلایا۔ شاعر نے اس کی خوبیوں پر نظر ڈالی اور کہا۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

انسان کی تلاش میں خالق کا ذکر لازم ہو جاتا ہے۔ بحث کا رُخ خُدا سے انسان کی جانب ہو یا انسان سے معراج کی طرف، اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ خالق نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ انجام بھی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ انسان نے پہلے صفّاتِ خداوندی کی فہرست بنائی پھر وہ صفّات مُستعار لے کر جو متشابہات میں شامل ہیں ایک ایسی مخلوق عالمِ خیال میں تخلیق کی جو دیو مالائی قرار دی گئی۔ بڑے آدمی کو دیو مالائی کسوٹی پر پرکھا گیا اور اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا کہ وہ مافوق الفطرت معلوم ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ شعور بیدار ہوا اور لوگوں کا اعتبار نا قابلِ اعتبار قصّے کہانیوں سے بالکل اُٹھ گیا۔ یہ عیاں ہوا کہ انسان احسن تقویم بھی ہے اور اشرف المخلوقات بھی اور اپنی ذات و صفّات کے سہارے اُن مقامات سے کہیں بُلند مقامات پر پہنچ سکتا ہے جہاں دیو مالائی افسانہ طرازیاں اُسے پہنچا سکتی ہیں۔ انسان

کی فطرت میں ہے کہ وہ بُلندی کی طرف مائل پرواز ہو۔ پستی میں وہ گر تا ضرور ہے مگر وہاں ٹھہر نہیں سکتا، کیونکہ یہ اُس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اگر وہ پستی سے ہمیشہ کے لئے سمجھوتہ کر لے تو اُس میں اور حیوان اور شیطان میں فرق ختم ہو جائے گا۔ یہی حال انسان کی بُلندیوں کا ہے، وہ اگر کسی خاص بُلندی پر اکتفا کر لے تو اُس میں اور آسمانی مخلوق میں فرق ختم ہو جائے گا۔ انسان اس فرق کو قائم رکھنے پر مُصِر ہے لہٰذا اس کو نہ ایسی پستی گوارا ہے اور نہ ایسی بُلندی پر قرار آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کچھ آدمی پستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور بیشتر عام سطح پر رہتے ہیں مگر ایک قلیل جماعت بلندیوں کو سر کرنے نکل پڑتی ہے تا کہ انسان کو اس کا اصل مقام حاصل ہو جائے، اس مقام پر پہنچنے والوں کے بارے میں مولانائے روم نے کہا ہے۔

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند

فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

اس شعر میں جن لوگوں کی طرف اشارہ ہے اُن سے ملاقات کی خواہش رکھتا ہوں مگر اس کے لیے نظر کہاں سے لاؤں۔ ابھی میری وہ جستجو بھی ناتمام ہے جو بہادر ولندیزی لڑکے کی کہانی سے شروع ہوئی تھی۔ اس سے فارغ ہوا تو کنگرۂ کبریائی کے قرب میں بسنے والوں کی تلاش شروع کروں۔ کہتے ہیں کہ یہ تلاش ساحلِ دریا سے شروع کرنی چاہئے، جہاں ایک بزرگ صورت ملتے ہیں جو منزل کا صحیح پتہ بتا دیتے ہیں۔ میں نے اس خاک دان کو اتنا دلچسپ پایا ہے کہ ابھی ساحلِ دریا تک نہیں پہنچا اور دِل کو اِس خیال سے بہلا لیتا ہوں کہ ہمدم دیرینہ کی ملاقات کو مسیحا و خضر پر ترجیح دینے والے قبیلے کا رُکن ہوں، حالانکہ سچ بات کچھ اور ہی ہے۔ ملک نے اپنے دریا فروخت کر دیے ہیں اور اب اُن کی سوکھی گزرگاہوں کے کنارے خضر کی تلاش عبث ہو گی۔ اب نہ دریا میں پانی ہے نہ انسان میں دریا دِلی۔ اس عالم میں جس نے چلنے کے لیے راستہ دے دیا وہی خضرِ شہر اور جس نے زندہ رہنے دیا وہی مسیحا بن گیا۔

میاں نصیر احمد جن دِنوں صوبہ مغربی پاکستان میں محکمہ مال کے افسرِ اعلیٰ تھے

ایک بار دورے پر بہاولپور آئے۔ رات کے دو بجے میں انہیں سمہ سٹہ کے ریلوے جنکشن پر لینے گیا۔ اس ناوقت ملاقات پر وہ خوش ہوئے مگر خوشنودی کو ان کی کم گوئی اور ضابطے کی پابند طبیعت نے اظہار کا موقع نہ دیا۔ میں نے نصیر صاحب کو جیپ میں بٹھایا اور بہاولپور کی طرف روانہ ہوا۔ رات کا آخری پہر تھا، سڑک کے کنارے پہلے ریت کے ٹیلے آئے پھر کھیت شروع ہوئے اور اُن کے بعد ایک جنگل۔ دُھندلکے میں کھجور کے درخت آسمان کو چھُو رہے تھے اور ریگزاروں کا آسمان بڑا شفّاف اور روشن تھا۔ نصیر صاحب کا غنچۂ دِل وا ہو گیا۔ بعض اشخاص اور مقامات کی طرح بعض اوقات بھی ایسے ہوتے ہیں کہ طبیعت کو ان سے کشادگی کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ آخرِ شب اور اوّلِ سحر کے اثرات کی سند نالہ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی کی روایات میں عیاں ہے اور درِ قبولیت کے اُس وقت کھُلنے کی سند **وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالأَسْحَارِ** میں پوشیدہ ہے۔ ابو الکلام نے اِسی وقت گراں مایہ کی کرشمہ سازیوں اور اپنی چائے نوشیوں کا ذکر کیا ہے جس کے ایک لمحے میں میاں نصیر احمد اپنے رکھ رکھاؤ اور لیے دیے رہنے کی پُختہ

عادت کو ترک کر کے اتنے قریب آ گئے کہ مجھے اُن کے قلب کی گہرائیوں میں جا نکلنے کا موقع مل گیا۔ نصیر صاحب نے ان لوگوں کا ذکر چھیڑ دیا جن کے دشتِ جنوں میں جبریل کو صیدِ زبوں سمجھا جاتا ہے۔ میں دیر تک اُن کی باتیں سُنتا رہا۔ سرکٹ ہاؤس کے وسیع ڈرائنگ روم میں آتش دان جل رہا تھا مگر اُس سے کہیں زیادہ حرارت اس ذکر میں تھی جسے تہجّد سے فجر تک میاں صاحب بیان کرتے رہے۔ میں نے ایک موقع پر عرض کیا کہ ہم غیب پر تو بخوشی کامل ایمان لاتے ہیں مگر انسان پر اُس کے حاضر ہونے کے باوجود اعتبار کرنے کے لئے تیّار نہیں ہوتے، کیونکہ یہ بازی گر کھُلا دھوکہ دیتے ہیں ظاہر اور حاضر کچھ، باطن اور غائب کچھ اور۔ نہ زندگی اتنی طویل اور فارغ کہ ہر ایک کو پرکھا جائے نہ بصیرت اتنی عام کہ ہر ایک پرکھ سکے۔ طبیعت اِس خیال سے کبھی اُداس اور کبھی باغی ہو جاتی ہے کہ یہ سب قصّے ماضی کے ہیں اور حال کے حصّے میں محض یادیں آئی ہیں یا محرومیاں۔ میاں نصیر نے کہا حال اتنا تہی دامن نہیں جتنا تم سمجھتے ہو اور ایک مردِ حق کا قصّہ سُنایا جو اُن کے مشاہدے کی بات تھی۔ میں نے کہا اُن کا تو انتقال ہو

چکا ہے کسی اور کا پتہ دیجئے، انہوں نے ایک اور نام لیا اور ملانے کا وعدہ کیا۔ سال بھر بعد میاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو یہ دوسرے صاحب بھی انتقال کر چکے تھے۔ کہنے لگے اس بار نام نہیں بتاؤں گا جب لاہور آؤ گے تب دیکھا جائے گا۔ خُدا کا شکر ہے کہ یہ شہر اچھے آدمیوں سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ میں چند سال کی غیر حاضری کے بعد لاہور واپس پہنچ تو شہر ایک اچھے آدمی سے محروم ہو چکا تھا۔ میاں نصیر انتقال کر چکے تھے۔ سُنا ہے ان کے جنازے میں وہ صاحب بھی شامل تھے جو زائد العمر ہو کر ریلوے کے ٹکٹ چیکر کی حیثیت سے فارغ ہوئے تو مفتی محمد حسن صاحب کے پاس جا پہنچے اور بیعت کی خواہش کی۔ جواب ملا کہ تیس برس کی ملازمت کی تمام ناجائز یافت کا حساب کرو۔ جو حق دار مل سکے اُسے لوٹا دو اور جس کا حق دار نہ ملے وہ محکمہ ریل کے کھاتے میں جمع کرا دو۔ تعمیلِ ارشاد میں اندازہ لگایا تو رقم ہزاروں میں نکلی۔ اندوختہ فروخت کیا اور رقم تقسیم کر دی، اپنا دامن جھاڑ کر اٹھے اور مُفتی محمد حسن کے دامن کو پکڑ لیا۔ میں نے سالہا سال لاہور سیکریٹریٹ میں کام کیا مگر کبھی خیال بھی نہ آیا کہ اُس سے ملحق کرشن نگر کی

بستی میں ایسے لوگ بھی آباد ہیں جو توبہ کے لیے سارا اثاثہ فروخت کر دینے کی ہمّت رکھتے ہیں۔ دفتر میں کام کرنے کا ایک نقصان یہ بھی ہے نظر صرف کاغذ پر جمی رہتی ہے اور انسان اس سے او جھل رہتا ہے۔ میں ایک بار دفتر سے باہر نکلا اور دوسرے ممالک میں پھرتا ہوا دُور جا پہنچا۔ سرِراہے ایک اہلِ حق سے ملاقات ہوئی جس کا سرور آج بھی ایسا ہے جیسے کل کی بات ہو حالانکہ جن سے ملاقات ہوئی تھی اُن کی وفات کو دو چار برس گذر چکے ہیں۔ میرے ذہن میں اس وقت یہی ذات تھی جب میں نے چاند پر اُترنے والے پہلے آدمی کو دیکھنے کے لئے ڈھاکہ جانے سے انکار کیا تھا۔ برنی نے کہا خلائی مسافر ڈھاکہ آرہے ہیں چلو انہیں دیکھ آئیں۔ مُمکن ہے اُن سے ملاقات کا بندوبست بھی ہو جائے۔ میں نے کہا خیال اچھا ہے مگر میں اِس مقصد کے لیے سفر کی شرط پوری نہیں کر سکتا۔ سفر تو صرف دو ہیں، ہجرت اور معراج، اِن کے علاوہ کسی اور مقصد کے سفر ہمیں منظور نہیں۔ خلائی مسافروں کے لیے میں کیونکر سفر کر سکتا ہوں جبکہ میں نے اکیلے بھی خاص سفر نہیں کیا تھا جن کے بارے میں دل گواہی دیتا ہے کہ مہر و ماہ ان کی

کمند میں تھے۔ جب میں ان سے ملا وہ لیٹے ہوئے تھے۔ وہ مدّت سے مفلوج تھے مگر بیماری کے نہ آثار نہ اثرات۔ دمکتا چہرہ کھنکتی آواز، طنطنہ ایسا کہ جب ایک ملک کی صدارت کا ذکر آیا اور میں نے پوچھا کہ سیاست میں اچھے لوگوں کی کمی کی شکایت کرنے والے خود اس کے اُمّیدوار کیوں نہیں بن جاتے، اور کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ناصح سیاست میں حصّہ لے کر مثال قائم کریں تو اُن کا مُنہ سُرخ ہو گیا، بڑی مُشکل سے مفلوج پاؤں کے پنجے کو حرکت دی اور کہنے لگے میں اس صدارت کو اس بے حس پاؤں تلے آنے والی خاک سے کمتر جانتا ہوں اور تم چاہتے ہو کہ اہلِ حق اپنی توجّہ اور توانائی اس راہ میں ضائع کر دیں۔ مجھے احساس ہوا کہ اُن کے پاؤں کی مٹّی کحلِ بصر ہے، میں نے آنکھوں میں لگائی تو اہلِ اقتدار اور اہلِ اتقا کا فرق نظر آنے لگا۔ آج اُن کے جلال و ارشاد کی یاد آتی ہے تو بیدلؔ کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے۔

آخر ز فقر بر سر دنیا زدیم پا

خلقے بجاہ تکیہ زد و ما زدیم پا

بہادر لڑکے کی کہانی سے إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ کی منزل تک سفر بڑا دلچسپ نکلا۔ اس سفر کے دوران یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی ایسی شاہراہ پر تنہا چلا جا رہا ہوں جس کے کنارے بڑے بڑے آدمی دورویہ کھڑے ہیں۔ جس کے پاس جی چاہا ٹھہر گئے اور دو باتیں کر لیں، جس سے ناخوش ہوئے اس سے آنکھیں ملائے بغیر آگے بڑھ گئے۔ یہ سفر بیشتر کتابی تھا۔ موضوع کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ ادبیات کے ہر حصّے پر محیط ہے، تاریخ، عمرانیات، نفسیات، ادب، سوانح، خاکے، مضمون، شہرِ آشوب، قصیدے اور ہجو۔ موضوع کے تنوّع کا یہ عالم ہے کہ یہ داستان بہ ہر عنوان پھیلی ہوئی ملی، مشاہیری اور مشاہیر پرستی، میری زندگی، اس کی سوانح، سرگذشت، اعمال نامہ، نا قابلِ فراموش، گنج ہائے گراں مایہ، ہم عصر، جرأت کے چہرے، روشنی کے مینار، دانشمندی کے ستون، عظیم شخصیت، دس بڑے لوگ، سو بڑے آدمی، بڑے آدمیوں کا انسائیکلوپیڈیا۔ اتنے بڑے سرمائے کو پڑھنے کے لیے ایک عمر اور ایک فرصت درکار ہے، یہ دونوں میسّر بھی ہوں تو اُن کے استعمال اور کتاب کے انتخاب میں احتیاط لازم

ہے۔ یہ احتیاط خود نوشت کے سلسلے میں بے حد ضروری ہے اور یہ عادت بے حد مُضر ہے کہ ہر بڑے آدمی کی خود نوشت سوانح کو پڑھا جائے۔ رزق ہی نہیں کتابیں بھی ایسی ہوتی ہیں جن کے پڑھنے سے پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے۔

یونان میں دیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے خواہ اسے دیدۂ عبرت سے بغور دیکھا جائے یا دُھلے ہوئے دیدے کی سرسری نظر سے۔ ایتھنز میں اکروپولس کی پہاڑی پر سیاحوں کا ایک گروہ کھڑا تھا، گائیڈ مختلف سمتوں میں اشارے کرتا اور ایک ازبر تقریر کو دُہراتا جاتا۔ سامنے منرواکا مندر تھا جن دِنوں پیری کلیس نے اُس عمارت کو تعمیر کیا وہ دنیا کی خوبصورت ترین عمارت تھی، آج اُسے سب سے خوبصورت کھنڈر کا درجہ حاصل ہے۔ سب کی نگاہیں مندر پر جمی ہوئی تھیں اور مسافر اُسے دیکھ کر عش عش کر رہے تھے۔ میری نگاہ البتّہ کاغذ کے چھوٹے سے پرزے پر جمی ہوئی تھی، یہ داخلے کا ٹکٹ تھا، میں نے اُس کی پُشت پر لکھی ہوئی عبارت کو بار بار پڑھا، اس پر لکھا تھا کہ پیری کلیس کے عہدِ حکومت میں ملک مالا مال اور لوگ نہال ہو گئے مگر وہ اتنا پُر نظر تھا کہ اُس کی ذاتی ملکیت میں چھوٹی

کوڑی کا بھی اضافہ نہ ہوا۔ میں نے اس عبارت پر غور کرنے کے بعد سر اُٹھا کر پا تھینن پر نظر ڈالی تو مجھے عمارت میں اس کے حسنِ صورت کے ساتھ اس کے بنانے والے کے حسنِ سیرت کی جھلک بھی نظر آئی۔ عمارت کی چھت ِگر چکی ہے مگر اس کے ستون دو ہزار برس سے ایستادہ ہیں، لغزش سے پیری کلیس خود بھی محفوظ رہا اور اس کے بنائے ہوئے ستون بھی۔ سورج کی روشنی میں یوں لگتا تھا کہ یہ عمارت دودھ میں نہائی ہوئی ہے۔ مُشفق پھُوٹی تو گویا اُس پر سنہرا پانی چڑھ گیا۔ پیری کلیس نے ایتھنز میں کتنی ہی عمارتوں پر سونے کا ملمع کرایا تھا، اب اس کی روایت کو شفق ہر روز پورا کرتی ہے۔ پیری کلیس کے عہد زرّیں کے بارے میں جو مقولہ ٹکٹ کی پشت پر چھپا ہوا تھا وہ پلوٹارک کی کتابِ سوانح سے نقل ہے۔ میں نے وہ ٹکٹ سنبھال لیا اور وطن واپس لے آیا۔ پلوٹارک کی ضخیم کتاب کون پڑھے گا، لیکن اُس کا یہ ایک جملہ شاید کسی صاحبِ اختیار کی نظر سے گذرے اور دل میں گھر کر لے۔ اس خیال کو کئی برس ہو گئے ہیں اور وہ ٹکٹ ابھی تک میرے پاس ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو بھیجوں، یک انار و صد

بیمار۔

پلوٹارک کی کتاب میں جابجا ایسے جملے بکھرے ہوئے ہیں جنہیں نقل کرنے اور حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ سارے جملے پلوٹارک کے نہیں ہیں، وہ چند جملوں کا مصنّف ہے اور باقی جملوں کا مؤرّخ۔ پلوٹارک سے میرا مفصّل تعارف اس چھوٹے سے کاغذ کے پرزے کی بدولت ہوا تھا جس پر لکھا تھا کہ پری کلیس بڑا پُر نظر تھا۔ کتاب کھولی اور پری کلیس کا باب نکالا، اس میں دو جرنیلوں کا مکالمہ درج تھا۔ سونو کلیز نے کسی کے حُسن کا ذکر کیا، بات نظّارہ بازی کی تھی، پری کلیس نے جواب دیا، میرے دوست، ایک جرنیل کے ہاتھ ہی نہیں اس کی نظر بھی پاک ہونی چاہیئے۔ اس پاک نظر کا ذکر سکندرِ اعظم کے باب میں بھی درج ہے۔ کہتے ہیں کہ سکندر نے ایرانی سپاہ کے خلاف بڑی بے جگری دکھائی اور ایرانی خواتین کے ساتھ بڑی دم داری سے پیش آیا، وہ شجاعت سے زیادہ شرافت کے لیے مُمتاز تھا۔ پلوٹارک نے کوئی پچاس بڑے آدمیوں کا حال لکھا ہے اور کئی آدمیوں کا ایک دوسرے سے موازنہ بھی کیا ہے۔ ہر شخص ایک

تصویر بن کر نظروں میں گھوم جاتا ہے مگر جو خوش رنگ تصویر سکندر کی جوانی کی ہے ویسی تصویر کوئی اور نہیں۔ سکندر کے کردار سے کچھ اس قسم کا اصول وضع ہوتا ہے کہ اگر خداداد صلاحیت موجود ہو اور اُس کی تربیت ارسطو اور لیونیڈس جیسے اساتذہ کے ہاتھوں ہو جائے تو دنیاوی معاملات کے بارے میں سوچنے کا انداز بالکل بدل جاتا ہے۔ اس اندازِ نظر کو جب الفاظ میسّر آتے ہیں تو وہ کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں، واحسرتا میرا باپ یوں فتوحات حاصل کرتا رہا تو میرے لئے کوئی بڑا کام باقی نہیں رہے گا، جب باپ ایک رات کثرتِ مے نوشی سے لڑکھڑانے لگا تو بیٹے نے کہا، اہلِ مقدونیہ گواہ رہنا کہ جو شخص یورپ سے لے کر ایشیا تک سارے ملک فتح کرنا چاہتا تھا وہ ایک میز سے دوسری میز تک نہ پہنچ سکا۔ ایک اور موقع پر سکندر نے اعلان کیا کہ دیماستھینز نے پہلے مجھے نادان کہا پھر نابالغ، میں ایتھنز کی فصیل پر دستک دوں گا تاکہ اُسے میری مردانگی کا پتہ چل جائے۔ پلوٹارک کی بدولت سکندر اور پارمینو کی وہ گفتگو بھی محفوظ ہے جو لڑائی سے پہلے دارا کی طرف سے صلح اور تحائف کی پیشکش کے بارے میں ہے۔

پار مینو نے کہا کہ اگر میں سکندر ہوتا تو یہ پیشکش قبول کر لیتا۔ سکندر نے جواب دیا کہ میں بھی اُس پیشکش کو ضرور قبول کر لیتا، اگر میں بھی محض پار مینو ہوتا۔ سکندر کی فتوحات اور اُس کی حاضر جوابی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ وہ گفتار اور کردار دونوں کا مردِ میدان تھا۔ وہ پار مینو کو لاجواب کرنے اور دارا کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن جب وہ سائرس کی قبر پر پہنچا تو نامرادی نے گھیر لیا۔ وہ دِل گرفتہ ہوا کہ اس جوش و خروش اور جنگ و جدل کا انعام دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی صورت میں مل سکتا ہے مگر اس کا انجام محض قبر کی تنہائی اور تاریکی ہو گا۔ سکندر کو سائرس نے رنجیدہ کیا اور جولیس سیزر کو سکندرِ اعظم نے۔ سیزر نے سکندر کا حال پڑھا تو رونے لگا کہ میری عمر تک سکندر کتنے ہی ملک فتح کر چکا تھا اور میرے اعمال نامے میں ابھی تک ایک درخشاں کارنامہ بھی نہیں ہے۔ جولیس سیزر کا یہ جملہ میں نے پڑھا اور میں بھی آزردہ ہوا۔ سکندرِ اعظم کی سوانح کا ایک استعمال جولیس سیزر نے کیا تھا اور دوسرا ہمارے فقیروں نے جو خیرات مانگتے ہوئے صرف اتنا یاد دِلاتے ہیں کہ ؏

سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

جن ہاتھوں نے دنیا بھر سے خراج وصول کیا اُن کے حوالے سے یہ لوگ خیرات مانگتے ہیں کیونکہ افراد اور اقوام واقعات سے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق سبق حاصل کرتے ہیں۔

پلوٹارک کو ذرا سا پڑھا اور بہت سی محرومیوں کا احساس ہونے لگا۔ پہلے زمانے میں یونان اور روما کے قریہ قریہ میں نادرہ روزگار لوگ ملا کرتے تھے اور اب ایسا کال پڑا ہے کہ انہیں مُلکوں مُلکوں ڈھونڈیے اور ناکام رہیے۔ پہلے زمانے میں آدمی اپنے کردار سے بڑا بنتا تھا اور ہومر، پلوٹارک اور فردوسی اُس کی عظمت کے محافظ بن جاتے تھے، اور اب ایسا اندھیر ہو گیا ہے کہ آدمی عظمت کا گاہک بن کر تعلقاتِ عامہ کے تجارتی اداروں سے شہرت خریدنے جاتا ہے۔ وہ مشاہیر تھے اور یہ صرف مشتہر۔ اُن کی شہرت میں قوّتِ بازو کو دخل تھا اور اِن کی شہرت میں صرف قوّتِ خرید کو۔ حدیث میں آیا ہے کہ شہرت اور ثواب میں بیر نہیں اور ذکر کی وہ افزونی جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے وہ بھی شہرت ہی کا ارفع درجہ

ہے۔ شہرت اور ذکر کا جو مقام حدیث و قرآن میں بیان ہے اُس کا کیا مذکور جب زندگی میں اعتدال جیسی معمولی صفت بھی غیر معمولی ہو کر رہ گئی ہے۔ اہلِ اقتدار اور اہلِ اختیار کی زندگی میں ایک دروازے سے اقتدار و اختیار داخل ہوتے ہیں اور دوسرے سے اعتدال اور توازن رُخصت ہو جاتے ہیں۔ جس نقّار خانے میں نعروں، تالیوں اور آمنا صدقنا کا شور ہو وہاں اعتدال کی حیثیت طوطی سے بھی کمتر ہوتی ہے۔ حاضر جناب اور حاضر باش غرض مندوں کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ حق گو، جو تنہائی پسند ہوتے ہیں اِس بھیڑ سے چھٹ جاتے ہیں۔ اہلِ اقتدار کے کان کلمۂ حق سے محروم ہو جاتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد یہ کلمہ اتنا مانوس ہوتا ہے کہ نہ اُسے سُننے کی تاب رہتی ہے نہ اُسے سمجھنے کی توفیق ہوتی ہے۔ ہر وقت آگے چلنا، اُونچا بیٹھنا، پہلے بولنا اور آخری حکم لگانا زہر کی طرح خون میں سرایت کر جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اِس لیے خدّام کے قدموں کی چاپ کو مہلک قرار دیا تھا مگر یہ نکتہ ہر ایک کی گرفت میں نہیں آتا۔ اہلِ اقتدار اپنے امتیازات کے بے بس قیدی بن جاتے ہیں۔ اِس قید سے صرف اِس شرط پر محفوظ

رہ سکتے ہیں کہ دِن میں پانچ بار محمود و ایّاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں اور اگر ایک اونٹ میسر آئے تو کبھی خلیفہ چڑھے اور کبھی غلام باری لے۔

اہلِ اقتدار کا ذکر ہو تو مُجھے بے اختیار 'کوبے بیف' یاد آ جاتا ہے۔ کوبے جاپان کا مشہور شہر ہے جہاں سے بڑا گوشت سوغات کے طور پر دساور بھیجا جاتا ہے۔ یہ گوشت اُس بیل کا ہوتا ہے جِسے پیدائش سے لے کر ذبح ہونے تک پینے کے لیے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں دیا جاتا۔ اس کی پرورش بڑے اہتمام سے ہوتی ہے، دودھ چھُڑاتے ہیں تو شراب پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ تمام عمر پانی کی بجائے شراب پیتا رہتا ہے۔ اُس کی بدمستی قابلِ دید ہوتی ہے، بہکی بہکی نظر، بوجھل پلکیں، ڈگمگاتے قدم، پینے والے اُس پر رشک کرتے ہیں اور کھانے والے اُسے دیکھ کر منہ میں پانی بھر لاتے ہیں۔ یہ بیل کب تک خیر مناتا، بالآخر ذبح کیا جاتا ہے اور اس کے پارچے خوش خور لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اہلِ اقتدار کی صورتِ حال اور قسمت بسا اوقات اُس بیل کی طرح ہوتی ہے۔ اقتدار کی سرمستی، اختیار کا نشہ، قوّت کا غرور اور اختیارات کا سرور اُن کی رگ وپے میں سما جاتا ہے۔ عقل

اور آنکھوں دونوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اُن کے چرچے بھی ہوتے ہیں اور کم نظر اُن پر رشک بھی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مقرّرہ وقت آن لگتا ہے۔ اُن کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور لوگ ہیں کہ بوٹیاں نوچ لیتے ہیں۔ اِس انجام کی مثال مسولینی کے انجام میں ملتی ہے۔ مسولینی نے کام کی ابتدا اچھے بھلے آدمی کی طرح کی تھی۔ اقبال ملے اور متاثر ہوئے۔ آہستہ آہستہ مسولینی کا مزاج بدلتا گیا۔ اُس نے اپنا دفتر ایک ساٹھ فٹ لمبے کمرے میں بنالیا۔ ملاقات کرنے والے کو کمرے کے ایک سِرے سے چل کر دوسرے سِرے تک جانا پڑتا اور اُسے اِس بات کا خیال بھی ہوتا کہ مسولینی اُسے دیکھ رہا ہے۔ فاصلے کی طوالت اور مسولینی کی ہیبت سے بہت سے لوگوں کے قدم اُکھڑ جاتے اور وہ مرعوب ہو جاتے۔ یہی اُس منظر کا مقصد تھا مگر اس اہتمام میں یہ حقیقت فراموش ہو گئی کہ جس نے مخلوق سے اتنا فاصلہ پیدا کر لیا وہ خالق سے کیوں کر نزدیک ہو سکتا ہے۔ لوگوں نے مسولینی کو نزدیک سے صرف اُن دِنوں دیکھا جب اُس کی لاش بازار میں لٹکی ہوئی اُس کے اِس دعوے کو جھٹلا رہی تھی کہ وہ عصرِ حاضر پر اپنی انا کے ایسے

نشان چھوڑ جائے گا جیسے شیر اپنے شکار کے جسم پر اپنے تیز ناخنوں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔

مسولینی کا ذکر یوں آ گیا کہ جس سال میں نے آٹو گراف البم خریدی اُس سے اگلے برس دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ ہر ایک کا دھیان جنگ کی طرف لگ گیا اور اس کا سایہ میری دلچسپی پر بھی پڑنے لگا۔ میں نے ذہن میں ابھی مشاہیر کا صحیح تعیّن بھی نہیں کیا تھا کہ جنگ میں کُشتوں کے پُشتے لگ گئے، تاریخ کے صفحات تیزی سے بھرنے لگے اور آٹو گراف البم کے صفحات یونہی خالی رہ گئے۔ میں نے سوچا یہ امن کا مشغلہ ہے، جنگِ عظیم ختم ہو گی تو دیکھا جائے گا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد آزادی آ گئی اور جب اُس کے استقبال سے ذرا فرصت ملی تو میں نے البم کی گرد جھاڑی۔ اب منظر اتنا بدل چکا تھا کہ کوئی نگاہوں میں نہ جچتا تھا۔ میٹھے کنوئیں یکایک اندھے ہو گئے، خنک سوتے خشک ہو گئے۔ ایک وہ دہائی تھی جو ۱۸۷۰ء سے شروع ہوئی۔ اِس دہائی میں بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے۔ گاندھی جی دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش میں اِس دہائی سے ایک

سال قبل ہی پیدا ہو گئے۔ وہ دس برس بھی کیا منتخب سال تھے کہ اگر یورپ میں چرچل، لینن اور اسٹالن پیدا ہوئے تو برِّاعظم میں قائدِ اعظم، علامہ اقبال، محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں بھی انہیں برسوں میں پیدا ہوئے۔ اِس کے بعد برِّاعظم میں نہ جانے مسلمانوں پر کیا اُفتاد پڑی کہ نہ دیوانے پیدا ہوئے اور نہ فرزانے۔ ہمارے حصّے میں تو بس ایک ہجوم آیا سرگشتہ اور برگشتہ۔ ۱۸۷۰ء کی دہائی میں پیدا ہونے والوں کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۵ء کی ربع صدی میں دنیا کا ہر بڑا کام نہ اُن کے بغیر چل سکتا تھا نہ بند ہو سکتا تھا۔اِس رعایت سے مُجھے پاکستان میں ان لوگوں سے توقعات تھیں جو بیسویں صدی کے پہلے بیس برس میں پیدا ہوئے تھے۔ ساری توقعات عبث ثابت ہوئیں۔ شاید اِن بیس سالوں میں مائیں صرف افسر اور تاجر ہی جنتی رہیں۔ ممکن ہے قدرت اِس فیّاضی کا جو اس نے انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں دکھائی تھی حساب لے رہی ہے۔ جو ملک اور قومیں اِس میزان پر پوری اُتریں انہیں مزید بڑے آدمی عطا ہوئے اور جو ناکام رہیں انہیں سزا کے طور پر ایسے لوگ ملے جو شامتِ اعمال ہوا

کرتے ہیں۔

قدرت کا سارا نظام اصولوں کے تابع ہے۔ بڑے آدمیوں کی پیدائش کے بھی تو کُچھ اصول ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔ عطا تو اُسی کے حق میں ہوتی ہے جو حق دار ہو۔ آخر قدرت ایک سپاس نا آشنا قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے، اُسے اپنے عطیے کی رسوائی اور بے قدری ناگوار گزرتی ہے۔ عطا کا پہلا حق یہ ہے کہ انسان اُس کا شکر ادا کرے۔ دل شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے، شکوہ کیجئے تو بُجھ جاتا ہے، ناشکر گزار ہو تو پتھر بن جاتا ہے۔ شکر گزار ہمیشہ روشن ضمیر اور روشن دماغ ہوتا ہے۔ ناشکر گزار بے ضمیر اور بد دماغ ہو جاتا ہے۔ مارکس اور ملییس بادشاہ بھی تھا اور فلسفی بھی۔ اُس کی حیثیت ایک صاف گُو اور عظیم انسان کی ہے جس کے جسم کا ہر رواں اگر زبان بن جاتا تو وہ بھی حرفِ شُکر کے لیے وقف رہتا۔ اپنے افکار میں اُس نے بزرگوں، دوستوں، اُستادوں، غلاموں اور کتنے ہی دوسرے انسانوں کا شُکر ادا کیا اور اس کی وجہ بھی لکھی ہے۔ مثلاً اُس

شخص کا شُکر جس نے اُسے احساس دِلایا کہ اُس کے کریکٹر میں اصلاح اور ضبط کی گنجائش ہے۔ اُس دوست کا شُکر جس نے بتایا کہ مصروفیت کو قطعِ تعلقات کا بہانا بنانا شیوۂ مردانگی نہیں، اُس فلسفی کا شُکر جس نے نفس پر حکومت کرنی سکھائی اور باپ کا شُکر جس نے مُلک پر حکومت کرنے کا راز بتایا۔ اپنے والد کے بارے میں مارکس نے لکھا ہے کہ وہ صحت کو عزیز رکھتا تھا نہ کہ زندگی کو اور جستجو سے صحیح راہ حاصل کرنا چاہتا تھا نہ کہ محض آرزو سے۔ وہ دوسروں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتا تاکہ ہر شخص کو اُس کے حصّے کا شرف حاصل ہو۔ باپ کا یوں شُکر ادا کرنے کے بعد مارکس دیوتاؤں کا شُکر ادا کرتا ہے جن کی بدولت اُسے ہر نعمت ملی، جن کے سہارے وہ نفس پر غالب آیا اور جن کی وجہ سے اُسے زندگی کو عین فطرت کے مطابق بسر کرنے کا موقع ملا۔ اگر کوئی کمی یا کوتاہی اُس کی زندگی میں ابھی باقی ہے تو وہ خود اُس کا ذمّہ دار ہے۔

انسان ناشُکر گزار، زود فراموش، فسادی اور زود ورنج ہے، اس لیے ہدایت ہوئی کہ خُدا کو یاد کرو اور اُس کا شُکر ادا کرو۔ خُدا نے والدین کا شُکر ادا کرنے کی بھی

تاکید کی ہے۔ گویا عبادت میں کسی اور کا ذکر تک داخل ہو تو وہ شِرک اور شُکر میں جتنے حصّے دار بھی شامل ہوں وہ جائز، مارکس کو یہ سبق یاد تھا۔ ہمیں بھولتے دیر نہ لگی۔ پاکستان ملا تو شُکر گزاروں پر نا شُکر گزار غالب آئے۔ تعداد کا حساب تو اللہ بہتر جانتا ہے مگر آواز اور اقتدار میں ہمیشہ نا شُکر گزار کو فوقیت رہی۔ وہ آیت حسبِ حال تھی جس میں ارشاد ہے کہ ہم نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا اور اِس میں تمہارے لیے سامانِ معیشت پیدا کیے (مگر) تم کم ہی شُکر کرتے ہو (۷:۱۰) نا شُکر گزاری کا نتیجہ بے ہُنری کی صورت میں سامنے آتا ہے اور جہاں نا شُکر گزار اور بے ہُنر جمع ہو جائیں وہاں منافقت کا دور دورہ رہتا ہے۔ جب اشراف کی حاجت ہی نہ رہے تو کوئی اُن کی تلاش اور دلجوئی کیوں کرے۔ ہنر وَر کی قدر ناشناسی سے بے ہُنری کو فروغ ملتا ہے۔ کم ظرف کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے تو اشراف کی عزّت میں کمی ہو جاتی ہے۔ منافقت کے لیے یہ فضا بڑی ساز گار ہوتی ہے۔ منافق کے دل میں کُچھ ہوتا ہے اور زبان پر کُچھ اور وہ دو قدم زبان کے ساتھ اُٹھاتا ہے اور چار قدم دِل ہی دِل میں پیچھے چلا جاتا ہے۔ جس قافلے میں

ایسے مسافر شامل ہوں اُسے نہ کبھی سمت ملی ہے اور نہ منزل۔ جہاں سے اُسے آگے روانہ ہونا چاہیے وہاں سے وہ پسپائی اور رسوائی کی راہ پر نکل جاتا ہے۔ ایسے کارواں میں عبرت اور ذوق کی کمی اور بے کسی و بے دِلی کی فراوانی ہوتی ہے کیونکہ عبرت وہ پکڑتے ہیں جو شُکر کرنا جانتے ہوں، ذوق اُن میں ہوتا ہے جو شرف و ہنر رکھتے ہوں۔ تمنّا ان کی جواں ہوتی ہے جو منافقت سے ناآشنا ہوں۔ اگر دل تشکّر کی طرف نہیں آتا، دماغ ہُنر کی طرف نہیں جاتا اور زبان حق کی طرف مائل نہیں ہوتی تو انسان انسان نہیں رہتا بلکہ دشت و صحرا میں بدل جاتا ہے۔ جب چاروں طرف بے کراں دشت آدم زاد کی شکل میں پھیلے ہوں تو اس صورتِ حال کو قحط الرّجال کہتے ہیں۔

جب آزادی ملی تو نقل مکانی کا مرحلہ بھی آیا۔ میرا کُل اثاثہ ایک جناح کیپ، سیاہ شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ اور ایک آٹو گراف البم تھی۔ جناح کیپ ایک تحریک سے وابستگی کی علامت تھی، سیاہ شیروانی سے میں نے بچپن میں مساوات کا پہلا سبق سیکھا تھا۔ جامے کی تراش میں علی گڑھ کا سارا فیض شامل تھا۔ میری

آٹو گراف البم البتّہ اُس جذبہ کی مظہر تھی جو مجھے کشاں کشاں مادرِ درس گاہ سے مادرِ وطن کی طرف لے جارہا تھا۔ پاکستان سے چھوٹی بڑی کتنی ہی اُمّیدیں بندھی ہوئی تھیں۔ آٹو گراف البم کی رعایت سے میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ کیا کیا یکتا و یگانہ سمٹ کر اِس مُلک میں آ گیا ہے۔ اُن میں کیا کیا ہُنر وَر ہو گا اور کیسا کیسا سخن وَر۔ برِّ عظیم کی وُسعتوں میں پھیلا ہوا فیض یہاں قریہ قریہ اور گلی گلی عام ہو گا۔ چند روز اِسی خوشی میں گُزر گئے۔ دو مصنّف اور عالم جن کا نام صرف اُن کی تصنیفات پر لکھا دیکھا تھا، وہ صحافی اور رہنما جنہیں صرف اخبار سے جانا تھا، وہ استاد جن کے صرف شاگردوں سے ملا تھا اور وہ تاجر جن کی صرف مصنوعات کو خریدا تھا، اب بنفسِ نفیس نظر آنے لگے۔ صُبح سیکریٹریٹ میں اُردُو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ملا۔ دوپہر کتابوں کی سب سے بڑی دُکان پر ایک بے بدل عالم سے ملاقات ہوئی۔ سہ پہر اورینٹ ائیر ویز کے دفتر میں ایک نامور شاعر کو دیکھا۔ شام کافی ہاؤس میں ایک عظیم مصوّر سے ملے۔ رات کھانے پر ایک ایسے رہنما جن کی صرف تقریریں سُنی تھیں اُن کی باتیں سُننے کا موقع ملا۔ اپنے شب و روز پر

رشک آیا، شاید اِنہی شب و روز کو شب برات اور عید کہتے ہیں۔ مجھے یہ اندازہ ہی نہ تھا کہ اِن لوگوں کے دِن پھر جائیں گے اور دِل بدل جائیں گے۔ شب و روز بھی ایک سے نہیں رہتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آوے کا آوا بگڑ گیا۔ سب کچھ بدل گیا۔ سوچ، نظریں اور زندگی۔ صورتیں سایوں میں ڈھل گئیں اور سائے اندھیروں میں ڈوب گئے۔ بہت سے اچھّے آدمی بھی اچھّے نہ رہے اور وہ چند اچھّے آدمی جو بچ رہے تھے روپوش ہو گئے۔

میں آٹوگراف البم لیے پچیس برس ایک شخص کا تعاقب کرتا رہا۔ پہلی بار اُن کا گھر ڈھونڈنے میں بڑی دقّت پیش آئی۔ وہ ایک بوسیدہ اور بے نشان گھر کے جزوی قابض تھے اور گھر پہنچ کر بھی یہ تلاش دشوار تھی کہ وہ اُس کے کون سے حصّے میں رہتے ہیں۔ وہ گھر پر موجود نہ تھے بلکہ گھر الاٹ کرانے کے لیے متروکہ جائیداد کے دفتر کے باہر قطار میں کھڑے تھے۔ میں نے پانچ سال ان کی آباد کاری کا انتظار کرتے کے بعد پھر اُن کے گھر کا رُخ کیا۔ ملاقات اب کی بار بھی نہ ہو سکی۔ میں ان کے گھر میں بیٹھا تھا اور وہ درآمد برآمد کے محکمے کی انتظار گاہ میں بیٹھے

ہوئے تھے۔ پانچ سال اور بیت گئے۔ میں اُن کے یہاں پہنچا مگر وہ گھر بدل چکے تھے۔ نیا گھر ایک اعلیٰ نو تعمیر رہائشی بستی میں تھا۔ نمونے میں نادر اور سجاوٹ بے مثال، گھر سامان اور افراد سے پُر مگر صاحبِ خانہ ندارد۔ معلوم ہوا کہ وہ کارخانے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے ہمّت نہ ہاری اور اپنے پنج سالہ منصوبے کے مطابق چوتھی بار اُن کے یہاں جا پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ عالمی سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ سفر کی نوعیت تجارت مع تفریح بیان کی گئی۔ وہ چمڑے کی تجارت کرتے تھے اور تفریح بھی کُچھ اِسی قسم کی ہوتی ہو گی۔ میں نہ معاش کی مصروفیتوں کا مخالف ہوں نہ انہیں عظمت کی راہ کی رکاوٹ سمجھتا ہوں۔ مگر پھر بھی دِل میں وسوسے اُٹھے۔ میں نے اُنہیں دبا دیا اور دِل کو معاشیات کا سبق پڑھانے بیٹھ گیا۔ حضرت آدم سے جناب ایڈم سمتھ تک اور اس وقت سے تا ایں دم دولتِ اقوام اِسی طرح چند لوگوں کی سوجھ بوجھ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ تو محسنین کی صف میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں۔ اِن کی لیاقت کی قدر کرو کہ تمہیں معاشی پستی سے نکال کر کارخانے کی چمنی کی طرح بُلند کر دیا۔ جہاں خاک اُڑتی تھی وہاں

اب چمنیوں کا دھواں اُڑتا ہے۔ دھوئیں کے یہ بادل جتنے سیاہ ہوں گے ملک پر اتنا ہی ہُن برسے گا۔ یہ لوگ اُن کالے بادلوں میں اُڑنے والے فرشتے ہیں، انہیں کچھ نہ کہو۔ دِل ایسی باتوں سے کہاں بہلتا تھا۔ مگر میں نے اُسے مزید پانچ سال باتوں میں لگائے رکھا۔ بالآخر پانچویں کوشش بار آور ہوئی۔ وہ شخص مُجھے مل گیا۔ مگر جویندہ یابندہ کی کہاوت غلط نکلی۔ وہ ایک نیا شخص تھا۔ آزادی سے پہلے وہ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں حاضری کے لیے ہزار میل کا سفر تیسرے درجے میں کیا کرتا تھا۔ آج وہ اپنی ذات میں گُم تھا اور ملک کے مسائل پر گفتگو کے لیے اُس کے پاس کوئی وقت نہ تھا۔ میں انہیں گھیر کر بڑی مُشکل سے اِس موضوع کی طرف لایا تو پتہ چلا کہ اُن کا تعلق اِس ملک سے اب صرف اتنا رہ گیا ہے کہ انہوں نے اُسے اپنے قیام کا اعزاز بخش رکھا ہے حالانکہ اُن کے لئے خدا کی دنیا وسیع ہے اور سوئٹزر لینڈ کے بنک بھی کھلے ہوئے ہیں۔ میں نے گذرے ہوئے زمانے کی طرف اشارہ کیا کہ شاید انہیں حیا آ جائے مگر وہ بڑے فخر سے اپنی کامیابیوں کی فہرست سُنانے لگے۔ فہرست بڑی طویل تھی، تیسری بیوی،

چوتھا کارخانہ، دسواں مقدمہ، بیسویں کمپنی، میں خاموشی سے سُنتا رہا۔ مگر جب اُس نے نئے پاسپورٹ اور دوسری شہریت کا ذکر کیا تو مجھے سکتہ ہو گیا۔

جونہی میرے ہوش بجا ہوئے میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر آٹو گراف البم کو مضبوطی سے پکڑ لیا تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خود بخود جیب سے باہر آ جائے اور وہ اُس پر دستخط کر دیں۔ اب مُجھے یہ دستخط درکار نہ تھے۔ چلتے وقت میں نے اپنا ہاتھ بھی جیب سے باہر نہ نکالا۔ انہیں یہ بات نہ عجیب لگی اور نہ ناگوار کیونکہ اب وہ مصافحے کو رجعت پسندی کی علامت سمجھتے ہیں۔

ایک بار کسی نے اعتراض کیا کہ مسلمان یونہی قحط الرّجال کا رونا روتے رہتے ہیں، سقوطِ بغداد کے بعد یہ اُن کی عادت بن چکی ہے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مہدی آخر الزّماں کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر کوئی کام کرنا چاہے تو کرنے نہیں دیتے، بولنا چاہے تو سنتے نہیں، لکھنا چاہے تو پڑھتے نہیں۔ اگر کوئی رہنمائی کرے تو لوگ غالبؔ کی طرح اُس کے پرزے اُڑا دیتے ہیں۔ یہ لیڈر کے پیچھے چلنے کے بجائے لیڈر کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ہندوؤں کو دیکھو وہ کتنے فرزانے ہیں۔ اپنے ہر

رہنما کو اوتار اور مہاتما بنا لیتے ہیں۔ ایک صاحبِ دِل نے اِس اعتراض کا یوں جواب دیا کہ ہندو کا دیوتا بے حس و حرکت بُت، اُن کی دھرتی ماتا پائمال، ان کی گاؤ ماتا بے زبان، وہ ہر حال میں اپنے لیڈر کو جو انسان ہوتا ہے ان سے بہتر پاتے ہیں اس لیے بے پایاں عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ مسلمان اپنے رہنما کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار قرنِ اوّل کی یاد آجاتی ہے۔ وہ اُسے سنّت کی کسوٹی پر گھستے ہیں اور سارا ملمع اُتر جاتا ہے۔ یہ کوئی نفسیاتی عارضہ یا اجتماعی نقص نہیں بلکہ معیار اور مزاج کا فرق ہے۔ یہ جواب نوّاب بہادر یار جنگ نے دیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میری آٹوگراف البم میں اُن کے دستخط موجود ہیں۔ میں نے البم اُٹھائی اور ورق الٹنے لگا۔

(۲)

میر عثمان علی خان کو میں نے بچپن میں پہلی بار اُس وقت دیکھا جب وہ وائسرائے کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے۔ وکٹوریا گیٹ سے اسٹریچی ہال تک اسکول کے

طلباء کی قطار بندی تھی۔ میں بال کے نزدیک قطار کے آخری سِرے پر کھڑے ہونے والے سب سے چھوٹے بچّوں میں شامل تھا۔ ایک پُر شکوہ جلوس ہمارے سامنے سے گزرا۔ لوگوں کی نگاہیں اُن شہزادیوں کی طرف اُٹھ رہی تھیں جو خلافتِ عثمانیہ کے برباد ہونے کے بعد دولتِ آصفیہ میں آباد ہو گئی تھیں۔ سادہ لوح سمجھے کہ اس پیوند سے کوئی نجات دہندہ پیدا ہو گا حالانکہ مُستقبل شہزادیوں کے بطن سے نہیں بلک بطنِ گیتی سے جنم لیتا ہے۔ لارڈ ولنگڈن اس سلطنت کا نمائندہ تھا جس کی وسعتوں پر سورج بھی غروب نہ ہوتا تھا اور دکن کی حیثیت اس سورج کے سامنے چراغ سے زیادہ نہ تھی۔ غلامی کے دِنوں میں ہمیں انگریز بہت گورا نظر آتا تھا لہٰذا لارڈ ولنگڈن کے سُرخ و سپید چہرے کے سامنے نظام بالکل سنولا گئے۔ کسی سے سُنا کہ نظام دنیا میں سب سے امیر شخص ہیں تو اُن کے ساتھ ہمدردی ہو گئی مگر وہ بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ جب یہ خبر ملی کہ ان کی ترکی ٹوپی کے کناروں پر میل کی تہہ جمی رہتی ہے تو دِل میں اُن کی طرف سے میل آ گیا جو آج تک نہیں گیا۔ نوّاب بہادر یار جنگ کے ساتھ اُن کے سلوک کو

یاد کرتا ہوں تو کچھ اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ کئی بار چاہا کہ نظام کو عظمتِ رفتہ کا آخری چراغ قرار دوں یا روشن مستقبل کی پہلی کرن مگر طبیعت اِس پر بھی راضی نہ ہوئی۔ دِل نے کہا تاریخ میں جگمگاتے عنوان ہی نہیں بجھا بجھا سا نوشتہ دیوار بھی ہوتا ہے۔ نظام نے بہادر یار جنگ کے حرفِ جنوں کو سُن کر ٹال دیا اور خود حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ اگر نظام اُن کی باتوں پر غور کرتے تو ریاست بہر حال چلی جاتی مگر نام رہ جاتا۔

محمد بہادر خاں کو بہادر یار جنگ کا خطاب جس فرمانِ شاہی کی رو سے ملاوہ رات کے ایک بجے جاری ہوا تھا۔ اس کے چند سال بعد جب بہادر یار جنگ کی شہرت کا سورج اوج پر اور خطابت کا سمندر موج پر تھا تو اُنہیں ایک روز نظام دکن کی طرف سے دو فرمان ملے جن کے عنوان عطا اور سزا تھے۔ بہادر یار جنگ نے طبیعت مشکل پسند اور حق پسند پائی تھی اس لیے سزا والے فرمان کی رسید لکھ دی۔ خطاب واپس ہوا اور جاگیر ضبط ہوئی، فقر میں اضافہ ہوا، عزّت اور توقیر بڑھ گئی، ثواب اور درجات کا حال دینے والے کو معلوم ہو گا۔ خطاب کی واپسی

میں بہادر یار جنگ کو خسارے کے بجائے سراسر نفع ہوا کیونکہ اس طرح ان کا اصلی نام انہیں واپس مل گیا جس میں حضور اکرمؐ کا نام بھی شامل ہے۔ تعجّب اس بات پر ہے کہ سزا کا فرمان بھیجنے والے کو وہ ادا کیوں بھول گئی جس سے خوش ہو کر اُس نے خطاب عطا کیا تھا۔ وکٹری پلے گراؤنڈ حیدر آباد دکن میں سیرت النّبی ﷺ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ نظام اچانک آ پہنچے، رعایا نے حکمران کو جلسے میں آتے دیکھا تو فرطِ حیرت سے ہلچل مچ گئی مگر مقرّر تھا کہ بار بار پکارتا تھا ''اے محمدؐ عربی کے تخت نشین و تاج پوش غلام آئیں تجھے بتاؤں کہ اس شہنشاہِ کونین کی نظر میں اندازِ ملوکیت کیا تھے۔ وہ جس نے دنیاوی قوّتوں سے بے باکی اور دنیاوی خواہشوں سے لاتعلقی کا مظاہرہ برسرِ عام کیا۔ اپنا شباب ذکرِ حبیبؐ کے لیے وقف کر چکا تھا، اسے عطا و سزا کے فرمان ملنے پر رحمۃ للعالمینؐ کا یہ جواب ضرور یاد آیا ہو گا ''اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر لا کر رکھیں اور چاند کو بائیں تب بھی میں اپنے کام سے نہ ہٹوں گا اور خدا کے حکم میں سے ایک حرف بھی کم و بیش نہ کروں گا۔ اس کام میں خواہ میری جان بھی جاتی رہے۔''

محمد بہادر خاں کی ساری زندگی صرف ایک محور کے گرد گھومتی رہی، جسے عشقِ رسولؐ کہتے ہیں۔ ان کی زندگی سن و سال کے حساب سے قلیل تھی مگر اُسے فکر کے لحاظ سے وقیع اور عمل کے لحاظ سے طویل کہہ سکتے ہیں۔ بہادر یار جنگ کی نصابی تعلیم بہت جلد ختم ہو گئی مگر وہ عمر بھر تفسیرِ قرآن، سیرتِ نبویؐ اور کلامِ اقبال کے طالبِ علم رہے۔ ان موضوعات پر ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور قدرت کی دریادلی سے اُنہیں زبان و بیان کی طاقت بھی اُن کے علم کی وسعت کے حساب سے عطا ہوئی تھی۔ محمد بہادر خاں نے ایک عمر حضورؐ کی حیات اور سیرت کے مطالعہ اور اس پر غور و فکر میں صرف کی۔ جو وقت بچا وہ ذکر و میلاد اور سنّت کی پیروی میں بسر ہو گیا۔ حضور کی سیرت نے انہیں سیاسی بصیرت اور حضور کے ذکر نے انہیں اعجازِ بیاں عطا کیا۔

بہادر یار جنگ کی سیاسی بصیرت کا یہ حال تھا کہ جس رائے کا برملا اظہار کیا وہ صحیح نکلی اور جس خطرے کی علی الاعلان نشاندہی کی وہ درست ثابت ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں تل ابیب کی نئی بستی کو دیکھا تو خواجہ حسن نظامی سے کہا کہ یہودیوں کو اب

فلسطین سے نکالنا اتنا آسان نہیں رہا جتنا عربوں نے سمجھ رکھا ہے۔ سقوطِ حیدر آباد سے دس برس پہلے اعلان کیا کہ دو سو برس کے حاکم ازلی و ابدی غلام بن جائیں گے۔ علامہ مشرقی کو قریب سے دیکھا تو انہیں لکھا کہ خاکسار تحریک کے بنیادی اصولوں سے کامل اتّفاق کے باوجود مُجھے آپ کی قیادت پر قطعاً اعتماد نہیں رہا۔ قائدِ اعظم سے ملے تو دُعا مانگی کہا اے اللہ تو میری عمر گھٹا کر اِس کو عمرِ طویل عطا کر۔ مسلم لیگ کے لیے بہت کام کیا مگر اِس کے بیشتر عہدیداروں کے بارے میں ہمیشہ یہ رائے رکھی کہ وہ اِس ملّت نا مسلمان کے قائل ہیں جسے دعویٰ اسلام ہو۔ قائدِ اعظم کے سامنے ایک بار یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان کا حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا پاکستان کو پاکستان بنانا مشکل ہو گا۔

بہادر یار جنگ کی زبان کی گرہ ذکرِ حبیبؐ نے کھولی۔ وہ نام ہر وقت اُن کی زبان پر رہتا تھا جس کو ادا کرنے کے لیے شاعر نے مُنہ کو ہزار بار مُشک و گلاب سے غُسل دینا بھی ناکافی سمجھا ہے۔ اس کے درد کی برکت اُن کے حصّہ آئی اور اُس کا اظہار اُن کی تقریروں میں ہونے لگا۔ میں نے بہادر یار جنگ کی پہلی تقریر اسکول کے

طالبِ علم کی حیثیت سے سیرت کے جلسے میں سُنی۔ میرے لیے وہ بالکل اجنبی تھے، میں نے اِس سے پہلے کبھی اُن کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ سیرت کا ہفتہ منایا جارہا تھا اور مہمان دور دور سے اُس میں شرکت کے لئے بلائے گئے تھے۔ نامور عالم، مشہور سیرت نگار، معروف مفسر اور ادبی اداروں کے معلّم بھی اپنی مخصوص سادگی اور وضع قطع کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ حفیظ جالندھری بھی آئے تھے اور عمر کے اُس دور سے گزر رہے تھے جب شاہنامہ اسلام سناتے ہوئے نہ وہ تھکتے تھے اور نہ اُن کے سُننے والے۔ ایسے عالمانہ شاعرانہ اور غریبانہ ماحول میں دولتِ آصفیہ کے ایک یار جنگ کو تقریر کی دعوت دینا میری سمجھ سے باہر تھا۔ بہت سوچا تو یہ خیال گزرا کہ شاید منتظمین کو اِس نوّاب سے چندہ ملنے کی توقع ہے جو ترکی ٹوپی، کسی ہوئی شیروانی اور تنگ پاجامہ پہنے تنگ نائے دکن سے چل کر مسلم یونیورسٹی میں آنکلا ہے۔ وہ خطاب یافتہ جاگیر دار تقریر کے لیے کھڑا ہوا تو پہلے اپنے دونوں انگوٹھے اچکن کی سامنے والی جیبوں میں اٹکائے، تقریر ہوئی تو اہلِ درد کو اِس جاگیر دار نے لوٹ لیا۔ کیا وہ جلسہ اور کیا وہ دِن یہ تقریر تو سیرت کے

پورے ہفتے کی تقریبات کا حاصل بن گئی۔ اس کے بعد اگلے چند سال لوگ اس ہفتے اور اس مقرّر کی آمد کا انتظار کرتے رہتے۔ اس روز تقریر ختم ہوئی تو میں نے اپنی اچکن کی جیب سے آٹو گراف البم نکال کر بہادر یار جنگ کے سامنے رکھ دی۔ بہادر یار جنگ نے البم کو ترچھا کیا اور صفحے کے وسط کے بجائے اُس کے نصف حصّے کے درمیان بڑی تیزی سے محمد بہادر خاں لکھا، اس کے نیچے چھوٹی سی لکیر لگائی، پھر ۳۰ اگست ۱۹۳۹، لکھا اور اس کے نیچے ایک بڑی سی لکیر لگا کر البم مجھے واپس کر دی۔ اِس وقت اُن کی عمر صرف ۳۴ برس کی تھی اور برصغیر کی تاریخ میں اپنا مُستقل مقام حاصل کرنے کے لیے اُن کے پاس صرف پانچ برس باقی رہ گئے تھے۔ دکن میں وہ بہت سے کام شروع کر چکے تھے۔ فجر کے وقت تفسیر، جمعرات کو درسِ اقبال، گاہے گاہے میلاد کی محفل اور تبلیغ کے جلسے، شب و روز اتحادِ مسلمین کی تنظیم کا کام۔ اب وہ برصغیر کے گوشے گوشے میں خاکسار تحریک، پاکستان تحریک، آل انڈیا مسلم لیگ، آل انڈیا اسٹیٹس لیگ کے ذریعے اسلام کا پیغام عام کرنے لگے۔ شاید انہیں احساس تھا کہ کام بہت پڑا ہے اور

مہلت بہت کم، اس لیے وہ ہر کام بہت تیزی اور تندہی سے کیا کرتے تھے۔ تیزی سے لکھا ہوا خط خوش خطی کے زمرے میں نہیں آتا مگر خلوص اور تندہی سے کیے ہوئے کام کارنامے بن جاتے ہیں۔

بہادر یار جنگ کا قد لانبا اور بدن دُہرا تھا، وہ خد و خال سے معمّر، فربہی سے معتبر اور ملبوس سے معزّز نظر آتے تھے۔ ایک روز خاکسار تحریک کے رُکن کی حیثیت سے انہیں پریڈ گراؤنڈ کے چکر لگانے کی سزا ملی۔ وہ حکم سُنتے ہی بلا چون و چرا میدان میں دوڑنے لگے، نہ حیثیت کا لحاظ نہ ہئیت کا خیال۔ جس نے بھی نظم و ضبط کا یہ مظاہرہ دیکھا وہ دنگ رہ گیا۔ سزا دینے والے بھی تعمیل کے اِس انداز سے متاثر ہوئے اور باقی سزا منسوخ ہو گئی۔ لوگ اُنہیں مقرّر کی حیثیت سے جانتے تھے اور عام خیال یہی تھا کہ مقرّر محنت اور عمل کی جو تلقین اپنی تقریروں میں کرتے ہیں وہ خود اُس سے مستثنٰی ہوتے ہیں۔ ڈیماستھینز نے شجاعت کے بارے میں اتنی شاندار تقریریں کہیں کہ ہزاروں آدمی اُنہیں سُن کر میدانِ جنگ میں جان پر کھیل گئے مگر جب وہ خود میدانِ جنگ میں پہنچا تو موقع ملتے ہی فرار ہو

گیا۔ یہ فرار ہمیں ہر ناصح محتسب اور مصلح کی زندگی میں ملتا ہے۔ لوگ حیران ہوئے کہ بہادر یار جنگ گفتار ہی نہیں کردار کا بھی غازی ہے۔ اپنے بیگانے بھی دکھ دینے کو تیّار ہیں اور یہ اصول کی خاطر ہر امتحان کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ نظام سزا دے تو قبول، علامہ مشرقی سزا دیں تو وہ بھی قبول، مہاراجہ کشمیر گرفتار کرنا چاہے تو یہ حاضر۔ بہادر یار جنگ جب باعمل عالم کی صورت میں سامنے آئے لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے۔ ان میں ایک گورنمنٹ درباری بھی شامل تھے جنہوں نے ۱۹۴۲ء میں ایک قصیدہ لکھ مارا۔ بہادر یار جنگ نے قصیدہ گو سے شکایت کی کہ آپ نے تعریف سے مطلع کر کے غرور کو ہوا دی اور خواہ مخواہ اپنا وقت اور پیسہ ضائع کیا۔ یہ نصیحت چنداں کارگر نہ ہوئی کیونکہ وہ قصیدہ گو اِس واقعہ کے بیس پچیس برس بعد بھی ہر سال ایک قصیدہ بھیجتے رہتے ہیں۔ میں ایک ایسے عہدے پر بھی رہا ہوں جہاں یہ ہر سال ایک قصیدہ پیش کرتے اور دو سو روپے انعام پاتے تھے۔ میری باری آئی تو میں نہ بہادر یار جنگ کی جرأت دکھا سکا اور نہ پیش رو کی دریادِلی۔ میں نے انہیں مایوس کرنے کے لیے فائل پر لکھا کہ

اِس کام کے لیے صرف سو روپے دیے جاسکتے ہیں۔ خیال تھا وہ انکار کر دیں گے اور یہ سلسلہ بند ہو جائے گا مگر انہوں نے یہ عطیہ قبول کیا اور رسید کے طور پر پھر ایک قصیدہ کہہ ڈالا۔ مجھے اُن کی ثابت قدمی سے زیادہ حیرت برٹش راج کی پیش بینی پر ہوئی جس نے اس ہونہار بروا کو اوائلِ جوانی میں ہی شناخت کر لیا اور گورنمنٹ درباری اور کرسی نشین کے اعزازات عطا کیے۔

بہادر یار جنگ کو جب ایک بار عہدے کی پیشکش ہوئی تو کہا۔ مجھے کرسئ وزارت پر بیٹھ کر امورِ مملکت پر غور کرنے کے لیے نہیں بلکہ گردِ کوچہ و بازار بن کر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ بہادر یار جنگ نے یہ طوفان اپنی تقریروں سے اُٹھایا تھا اور اتنے سال گزرنے کے باوجود اس طوفان کی ایک لہر آج بھی میرے دِل میں موجزن ہے۔ میں نے انہیں کئی بار سُنا تھا۔ اُن کی تقریر کبھی آتش فشاں ہوتی اور کبھی آبشار۔ بعض تقریروں میں یہ دونوں صورتیں جمع ہو جاتیں۔ وہ تقریریں جن میں برِّ عظیم کی آزادی اور پاکستان کا مطالبہ ہوتا یا فکر و عمل اور سرفروشی و جانبازی کی تلقین ہوتی بالکل آتش فشاں کی

مانند ہوتیں۔ آگ اور حرارت کا سیلِ بے پناہ جو ہر مقابل پر حاوی ہو جائے اور ہر رکاوٹ پر غالب آ جائے۔ جو تقریریں اسوۂ رسولؐ، مسلمان کی نا مسلمانی، ایمان کی کمزوری، اتّحاد کی کمی، فکرِ صحیح سے محرومی اور راہِ حق سے انحراف کے بارے میں ہوتیں وہ ایسے آبشار کی طرح تھیں جو یہ کہتے ہوئے نیچے گر رہا ہو کہ اچھا تم میری سطح تک بُلند نہیں ہوتے تو لو میں بُلندیوں سے اُتر کر تمہاری کشتِ ویراں کو سیر اب کرتا ہوں۔

عام طور پر جذباتی تقریریں جب احاطۂ تحریر میں لائی جاتی ہیں تو وہ بہت معمولی لگتی ہیں۔ کسی واقعہ یا حادثے کی نسبت سے کی ہوئی دھواں دھار تقریر پر جب کچھ وقت بیت جائے اور اُسے پڑھنے والا ذہنی طور پر اُس لمحے سے بہت دُور ہو جائے جو سامعین کو میسّر تھا تو ایسی تقریر بجھی ہوئی آگ کے دھوئیں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یوں بھی مقرّر کی ذات، صفّات، انداز اور آہنگ سے تقریر میں تاثر پیدا ہوتا ہے اور تحریر میں اُن کی غیر موجودگی سے جو کمی واقع ہوتی ہے وہ وقت کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک مدّت گزرنے کے بعد

تقریر پڑھنے کی چیز ہی نہیں رہتی۔ جو تقریر اِس اصول سے مستثنٰے ہو اُسے کلاسیک میں جگہ مِل جاتی ہے۔ ایک دوست نے جو یہ رائے سُنی تو پوچھنے لگے کہ یہ جو ہم تم بہادر یار جنگ کے جلسوں میں پروانہ وار جاتے اور ان کی تقریروں پر دیوانہ وار سر دُھنتے وہ کہاں تک جائز تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ایک لمحے کے جادو اور ایک یادداشت کے فریب میں آکر یہ کہہ دیتے ہیں کہ بہادر یار جنگ سا مقرّر نہ دیکھا اور نہ سُنا۔ میرے یہ دوست عمر کے اس حصّے اور عہدے کے اُس درجے پر ہیں جہاں سوچ کی نہج بدل جاتی ہے اور سارا ماضی مشتبہ اور مشکوک نظر آتا ہے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ بہادر یار جنگ کی ایک مشہور تقریر کا تجزیہ کروں گا تاکہ اُن کی تسلّی ہو جائے۔

بہادر یار جنگ نے اپنے خطوں کی نقلیں محفوظ رکھیں مگر اُن کی تقریروں کا کوئی مجموعہ نہیں ملتا۔ ان کی صرف دو چار تقریریں محفوظ ہیں اور ان میں وہ تقریر بھر شامل ہے جو ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے موقع پر کراچی میں کی گئی تھی۔ یہ بلاشبہ اُن کی نہایت کامیاب سیاسی تقریر ہے۔ میں نے

اِس تقریر کا تجزیہ اپنے دوست کو پیش کیا تا کہ وہ اپنے ماضی سے اتّفاقِ رائے کر لیں۔ بہادر یار جنگ نے یہ تقریر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے آخری روز کی تھی۔ یہ اُس اجلاس کی آخری تقریر ہو گی۔ اس کے بعد سال بھر تک ایسا موقع نہ آئے گا اور کسے خبر تھی کہ اُس وقت یہ مقرّر موجود نہ ہو گا۔ تقریر کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دم کو غنیمت جان کر بول رہے ہیں اور ذرا دیر میں برخاست ہونے والے اجلاس کے سامعین سے دِل کھول کر ایسی باتیں کرنا چاہتے ہیں جن کا تاثر اگلے اجلاس تک ہی نہیں بلکہ مُستقل اور مسلسل ہو۔ زمانے کے اعتبار سے یہ تقریر قرار دادِ پاکستان کی منظوری کے چار برس بعد کی جا رہی تھی۔ تحریکِ پاکستان مقبول ہو چکی تھی۔ محمد علی جناح اب قائدِ اعظم کہلاتے تھے۔ تحریک جواں تھی اور قائدِ اعظم جواں ہمّت تھے مگر رہ رہ کر یہ خیال بھی آتا تھا کہ عمر کے لحاظ سے قائدِ اعظم ضعیف ہیں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو تحریک کو ضعف آ جائے گا۔ کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ مسائلِ ہند کے آخری سیاسی فیصلے کے وقت اس قرار داد سے محض پاسنگ کا کام لیا جائے گا۔ کبھی یہ شُبہ بھی ہونے لگتا

کہ اتنی بڑی تحریک کی کامیابی کے لئے ایک طویل جدوجہد درکار ہو گی اور اتنا عرصہ لوگوں کے دِلوں کو اسی طرح گرمائے رکھنا کیونکر ممکن ہو گا۔ بہادر یار جنگ کی تقریر میں بے یقینی کے بجائے ایک غیر متزلزل یقین ملتا ہے اور وہ سامعین کے جذبات کو سدا اُس درجہ حرارت پر دیکھنا چاہتے ہیں جس کا نام اسلام ہے۔ ان کی تقریر کا خلاصہ ایک جملے میں یوں کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان برحق ہے اور آج نہیں تو کل بن جائے گا، اُس کے حصول کے لیے نقد عمل اور اُس کے قیام اور بقا کے لئے انقلابِ محمدیؐ کی ضرورت ہے۔ تقریر کے دو حصّے اور ہر حصّے کے تین ذیلی حصّے ہیں۔ اگر اُن کے عنوانات قائم کیے جائیں تو کچھ یوں ہوں گے۔ پہلا حصّہ حصولِ پاکستان، دوسرا حصّہ قیامِ پاکستان، پہلے حصّے کے ذیلی عنوانات صُبحِ اُمّید، روزِ عمل اور پیشکش ہوں گے اور دوسرے حصّے کے دستور، نظامِ تعلیم اور نظامِ معاش، ختمِ کلام کا عنوان اتباعِ سنّت ہو سکتا ہے۔ خِرد اور جنوں کا جو امتزاج اس تقریر میں ملتا ہے اس کی مثال اُردُو ادب میں جو چند تقریریں محفوظ ہیں اُن میں نہیں ملتی۔

یہ تقریر دھیمے انداز سے شروع اور اِسی انداز سے ختم ہوتی ہے۔ پہلا وار طنزیہ اور ناصحانہ ہے اور اس کے لئے غالبؔ کا شعر منتخب کیا ہے۔ آخری وار طنزیہ اور حکیمانہ ہے جس کے لیے اقبال کا سہارا لیا ہے۔ غالبؔ اور اقبال کے درمیان جو مسافت ہے اُس میں تین مرتبہ جوش بڑھتا ہوا، ایک نقطۂ عروج پر جا پہنچتا ہے مگر چوتھی بار نقطۂ عروج اچانک آہستگی سے آجاتا ہے اور تقریر وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ وہ نقطہ ہائے عروج پاکستان سے متعلّق ہیں اور دو ملّی حمیت کے بارے میں ایک بار دو قومی نظریے کی حمایت کرتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ اگر پاکستان بہ التجا نہیں مل رہا تو ہم بزور حاصل کریں گے اور پھر تقریر کے دوسرے حصّے میں مسلم لیگ پلاننگ کمیٹی سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایسی تجاویز مرتب کرے جو پاکستان میں اسلامی دستورِ حیات، اسلامی نظامِ تعلیم اور اسلامی معاشی نظام کے رائج کرنے میں مددگار ہوں۔ اس موقع پر قائدِ اعظم کو اس طور سے مخاطب کیا جس کی جرأت قائدِ اعظم کی زندگی میں کسی اور کو نہ ہو سکی۔ کہنے لگے کہ قائدِ اعظم میں نے پاکستان کو اِسی طرح سمجھا ہے اور اگر آپ کا پاکستان نہیں

ہے تو ہم ایسا پاکستان نہیں چاہتے۔ مقرّر کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف پاکستان بزور حاصل کرنے کا عزم ہے اور دوسری طرف پاکستان ملے تو لینے سے انکاری ہیں۔ دونوں صورتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں میں زورِ بیان انتہا پر ہے۔ لوگ پہلی صورت میں بھی اتنے ہی پُر جوش ہو جاتے ہیں جتنا دوسری صورت میں۔ ایک مختصر تقریر میں سامعین کے جذبات کو یوں قطبین تک لے جانا اور واپس لے آنا مقرّر کے فن کا کمال ہے۔

اس تقریر کا سب سے موثر حصّہ وہ اعلان ہے جو مسلم لیگ کی کونسل آف ایکشن کو اپنی خدمات پیش کرنے کے متعلّق ہے۔ تقریر کا ایک عامیانہ انداز میں ہے کہ مقرر اپنے مقصد کے حصول کے لئے خون کا آخری قطرہ بہا دینے کی تلقین یا وعدہ کرتا ہے۔ چند نعرے اس موقع پر سامعین کی طرف سے بھی لگ جاتے ہیں اور بات رفت و گذشت ہو جاتی ہے۔ بہادر یار جنگ پہلے ہی مال و جاہ کی قربانی دے چکے تھے اور زبان بندی کی پابندی بھی سہ چکے تھے۔ ہر شخص اُن کی اِن قربانیوں کا قائل تھا مگر وہ خود انہیں ناکافی سمجھتے تھے اس لیے ہزاروں گواہ بنا کر

اجلاس میں ایک نیا عہد کرتے ہیں۔ اِس کے گواہوں میں قائدِ اعظم، سامعین، سورج، ہوا اور کرّ دبیاں کو شامل کیا مگر اس پر اکتفا نہ کی اور خدائے قادر و قیوّم کو حاضر و ناظر جان کر عہد کیا کہ ملّتِ محمدی کے راستے میں جس دِن اُن کے ہاتھوں میں جھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہوں گی اور جسم زخموں سے چور ہو گا وہ اُن کے لیے عید کا دِن ہو گا۔ سامعین گرما گئے، زندہ باد کے نعرے لگے، سبحان اللہ اور مرحبا کی آوازیں آئیں، پھر سب نے بیک آواز کہا کہ وہ بھی اِس راہ میں مقرر کے ساتھ قربان ہونے کے لیے تیّار ہیں۔ ایک ایسی تقریر جس پر مقرر غور و فکر کر چکا تھا اور سامعین اس کے ایک نقطہ عروج پر پہنچ کر مقرر کو اپنی خدمات پیش کر رہے تھے یکایک مقرر اور سامعین کے ایک فی البدیہہ مکالمے سے تاثر اور کامیابی کی انتہائی منزل پر جا پہنچی۔ تقریر کے اِس حصّے کا اقتباس اگرچہ قدرے طویل ہے مگر بہادر یار جنگ کی ذات اور اُن کے فنِّ خطابت کو سمجھنے کے لیے اِس سے بہتر کوئی اور اقتباس نہیں ہو سکتا۔ جو نہی مجمع سے آوازیں آئیں کہ ہم بھی آپ کے ساتھ قربانی دینے میں دوش بدوش ہوں گے، بہادر یار جنگ نے کہا۔

"اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے۔ میں نے اپنے جس عزم کا آج اظہار کیا ہے وہ میرے بارہ سال کی شبانہ روز فکر و تعمق کا نتیجہ ہے۔ میں نے اِس کی تیّاری اور اِس پر عمل بھی شروع کر دیا، جاؤ اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو، اپنے بچوں کی مُسکراہٹ کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو، اپنی تجارت اور ذرائع معیشت کی ساری تباہیوں کا تصوّر کر کے ایک مرتبہ تصفیہ کرو، مسلمانو! جو تصفیے جوش کے عالم میں دوسروں کی تقلید میں کر دیے جاتے ہیں بسا اوقات آئی اور اس لئے فانی ہوتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے جو شجرِ ملّت میں پھول بن کر چمکنا چاہتے ہوں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں۔ ہمیں اُن کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ جو مٹّی اور پانی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتے ہیں۔ جو خود فنا ہوتے ہیں اور پھلوں میں لذّت و شیرینی پیدا کرتے ہیں۔ ہم کو اُن کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہِ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں۔ ہم ان بنیاد کے پتھّروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہو کر اور مٹّی کے نیچے دب

کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں۔"

میرے دوست نے جب یہ سُنا تو کہنے لگے کہ یہ شخص بڑے غضب کا نکلا، ایک عظیم خطیب اور ایک عظیم تر انسان، گفتار میں فرد اور کردار میں مرد۔ طالبِ علمی کے زمانے میں ہم نے انہیں جو کچھ سمجھا تھا وہ ان کے مرتبے سے کم تھا۔ افسوس کہ ہم اِن کے مقام اور اِن کی منزل کو نہ پہچان سکے۔ بہادر یار جنگ نے جامعہ عثمانیہ کے ایک استاد کو ایک خط میں لکھا۔ "اب سنیے میری منزل کیا ہے؟ میری منزل مسلمانوں کو منفرداً اور جماعت اسلامیہ کو مجتمعاً منہاجِ نبوّتؐ پر دیکھنا ہے۔ میرا عمل، میری مجلس کی قرارداد میں اور میری تقاریر اس اجمال کی تفصیل ہیں۔ گو ہمّت عالی کے نزدیک یہ منزل بھی سنگِ میل ہے اور حقیقی منزل تاجِ خلافت الہیہ کا زیبِ سر کرنا اور فرشتوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھنا ہو سکتا ہے۔" میرے دوست جذبات سے مغلوب ہو گئے اور زیرِ لب بولے، کیا عجب کسی فرشتے نے خدا سے التجا کی ہو کہ محمد بہادر خاں کی آخری خواہش بھی پوری ہونی چاہیے۔

(۳)

میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ جن دو آدمیوں کے دستخط لیتے ہوئے مجھے ایک کی تیزی اور دوسرے کے ٹھہراؤ نے متاثر کیا ہے اُس کا تعلّق اُن کی باقی ماندہ عمر سے ہے۔ بہادر یار جنگ جوان تھے مگر لکھنے میں اتنے تیز قلم جیسے انہیں خبر ہو کہ فرصتِ حیات ختم ہونے کو ہے اور ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔ اُن کے برعکس جس بوڑھے نے ٹھہر ٹھہر کر دستخط کئے تھے اُسے شاید یقین تھا کہ خوش وقتی کے لیے ابھی تہائی عمر باقی پڑی ہے۔ یہ بوڑھا ایک انگریز ناول نگار تھا جو دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہونے کے چند ماہ بعد علی گڑھ آیا تھا۔ جنگ کے دوران اس کا وہ مکان بھی تباہ ہو گیا جس میں وہ اپنی سال خوردہ ماں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ میں اس طویل جنگ کے اثرات اُس کے چہرے پر تلاش کر رہا تھا مگر وہاں نہ ملال تھا اور نہ اضمحلال۔ تھوڑی سی مسکراہٹ تھی اور بہت سی فراست۔ اس کے انداز میں ایک ایسا ٹھہراؤ تھا جیسے غم، غربت اور جہالت نے بھی اُس کا راستہ نہ کاٹا ہو۔ ہلکے سفید بال، نیلی آنکھیں اور چھوٹی سی دھنسی ہوئی ٹھوڑی، اس کے ارد گرد

خود اعتمادی اور خوشگواری کا ایک ایسا ہالہ تھا جو کامیاب زندگی اور مطمئن دل کا عطیہ ہوتا ہے۔ اسے دیکھا تو ڈاکٹر ایل کے حیدر کی دعا یاد آئی کہ یارب بڑھاپا دے تو خوشگوار دینا۔

جون کی آٹھ تاریخ تھی اور عیسوی سال ۱۹۷۰ء تھا۔ ریڈیو پاکستان سے سہ پہر کی خبر میں کسی خاتون کی زبانی نشر ہو رہی تھیں۔ اعلان ہوا کہ اِس وقت پوربو پاکستان میں دِن کے چھ اور پچھمی پاکستان میں پانچ بجے ہیں، اب خبریں سُنیے، سب سے بڑی خبر تو اُس خاتون نے خبر میں شروع کرنے سے پہلے ہی سُنا دی تھی کہ ملک کے دونوں حصّوں میں اب وقت کی رفتار یکساں نہیں رہی۔ جب خبریں شروع ہوئیں تو خاتون نے کہا کہ کل انگلستان کے مشہور ادیب ای ایم فاسٹر کا اکانوے سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا اور میز کا دراز کھولا، آٹوگراف البم کے دسویں صفحے پر ای ایم فاسٹر کے دستخط ہیں۔ خط واجبی سا ہے، لکھائی گنجلک، سارے الفاظ ایک دوسرے میں پیوستہ ہیں۔ پہلے تین لفظ آخری چھ لفظوں سے زیادہ جگہ گھیرے ہوئے ہیں۔ دستخط کی نشست بھی درست

نہیں۔ یہ دستخط میں نے یونین ہال میں حاصل کیے تھے۔ وہ سال ۱۹۴۵ء تھا، اور نومبر کی تیسری تاریخ تھی۔ بوڑھے فاسٹر کے اعزاز میں جلسہ ہو رہا تھا، اس کی صدارت جو نوجوان طالب علم کر رہا تھا اُس کے انتقال کو بھی شاید اب کئی سال گزر چکے ہیں۔ اس جلسے کے بائیس برس بعد جب فاسٹر اٹھاسی سال کی عمر میں سخت بیمار ہوا تو سنڈے آبزرور اخبار نے اس کے ایک بے تکلّف اور کم عمر دوست سے تعزیتی مضمون لکھوایا۔ فاسٹ صحت یاب ہو گیا اور تعزیت نامہ لکھنے والا چل بسا۔ یہ مضمون بالآخر ۱۹۷۰ء میں چھپا۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے میں اس غیر معمولی انسان کے لیے کون سا لقب استعمال کروں جو اس کو حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا قسم کے اچھے بھلے آدمیوں سے ممتاز کر سکے۔ کیا میں اسے Saint کہوں لیکن نہیں مجھے قبر سے اس کی آواز آ رہی ہے۔ ارے یار تم یہ کیا زیادتی کر رہے ہو۔

فاسٹر جب تیس برس کا تھا تو اُس کے چار ناول چھپ چکے تھے، اس نے پینتالیس برس کی عمر میں پانچواں ناول شائع کیا اور زندگی کا باقی نصف حصّہ اپنے پانچ

ناولوں سے حاصل کی ہوئی دولت اور شہرت کے سہارے بسر کر ڈالا۔ یہ سوال کئی بار اُٹھا کہ اس نے ناول لکھنے کیوں بند کر دیے۔ یہ سوال انار کلی کے مصنّف کے بارے میں بھی اُٹھتا رہتا تھا۔ انار کلی ڈرامہ ایک طالبِ علم نے لکھا اور اُس کے بعد اُردُو کے مشہور ادیب سیّد امتیاز علی تاج نصف صدی تک اُس پائے کی تحریر نہ لکھ سکے۔ میں نے یہ سوال ایک نقّاد سے کیا تو کہنے لگے کہ سیّد امتیاز علی تاج اس مشقت کی عادت نہ ڈال سکے جو تخلیق کے لیے ضروری ہے۔ وہ خونِ جگر صاف کرنے سے جی چراتے رہے اور بات آج کل پر ٹلتی رہی یہاں تک کہ برسوں گزر گئے اور وہ زمانہ آگیا کہ اگر وہ چاہتے بھی تو ایسا نہ لکھ سکتے۔ نقّاد کی یہ بات میرے سمجھ میں آئی مگر اس کی یہ ادا سمجھنے میں دیر لگی کہ جب اُن سے اِسی قسم کا سوال ٹیلی وژن پر پوچھا گیا تو جواب بالکل نیا تھا، کہنے لگے کہ تاج صاحب کے سامنے دو راستے تھے، انہوں نے بڑے غور و فکر کے بعد اپنی راہ متعیّن کی تھی، ان پر اُردُو ڈرامے کی مستند تاریخ لکھنے اور نایاب کلاسیکی ڈراموں کی تدوین کا شوق اس درجہ غالب آیا کہ انہوں نے خود لکھنے کو زیادہ اہمیت نہ دی، اور یوں

تحقیق کی راہ میں تخلیق کو قربان کر دیا۔ ہمارے نقّاد نے بھی سچ کو مصلحت پر قربان کر دیا، مجھ سے ایک بات تنہائی میں کہی اور دوسری سب کے سامنے ٹیلی وژن پر۔ پہلے جھوٹ اور بُرائی کے لیے خلوت کا استعمال ہوتا تھا، اب نیکی اور راست گوئی کو صرف تنہائی راس آتی ہے۔ غلط گوئی اور بُرائی علی الاعلان اور بر سرِ عام کی جاتی ہے۔ فاسٹر البتّہ بے باک اور صاف گو تھا۔ جب اُس سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں نہیں لکھتا تو اُس نے جواب دیا۔ ”میں جس عہد کے بارے میں لکھتا تھا وہ بیت گیا۔ اب نہ وہ گھر ہے اور نہ وہ گھر والے، نہ ہی اس زمانے کا سکون۔ سب کچھ بدل گیا ہے اور میں اگرچہ نئی دنیا کے بارے میں سوچ سکتا ہوں مگر اِس کو ناول میں ڈھالنے سے قاصر ہوں۔“ فاسٹر نے تو صرف اپنی کیفیت بیان کی ہے مگر دو اصول جس کا ہر لکھنے والے پر اطلاق ہوتا ہے یہ ہے کہ لکھنے کی ایک امنگ ہوتی ہے کہیں قطرہ اور کہیں قلزم، اس امنگ کی عمر بھی ہوتی ہے کبھی لمحہ اور کبھی عصر۔

فاسٹر نے جس دنیا اور جس زمانے کے بارے میں ناول لکھے وہ اس کی تحریروں

میں اپنی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ محفوظ ہیں۔ یہ ایک عام بات ہے اور کئی تحریروں کے بارے میں کہی جاتی ہے، مگر زمانے کو یوں محفوظ کرنے والی تحریریں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ بیشتر وہ جن میں زمانہ حنوط شدہ لاش کی طرح محفوظ ہوتا ہے اور معدودے چند ایسی جن میں ہر شے ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ فاسٹر کی تحریروں میں یہی کمیاب تازگی ملتی ہے، فاسٹر کے بہترین ناول کا موضوع شروع صدی کا غلام برطانوی ہندوستان ہے۔ اس ناول میں مشاہدے اور محسوسات کا ایک انبار لگا ہوا ہے۔ ان کی وسعت اور گہرائی پر ان انگریزوں کو بھی حیرت ہوئی، جن کی ملازمت کی ساری مدّت ہندوستان میں بسر ہوئی تھی۔ ہر شخص کو نہ وہ نظر ملتی ہے جو ایک جھلک میں سب کُچھ دیکھ لے اور نہ وہ دل میسّر آتا ہے جسے ہر دھڑکن کے ساتھ القا ہوتا ہے۔ فاسٹر کے حصّے میں بہت کچھ آیا تھا، نظر کی باریکیاں بھی اور بیان کی خوبیاں بھی۔ اس کے یہاں ترتیب اور بیان کا وہ سلیقہ اور چابک دستی ہے کہ بڑی بڑی باتیں محض ایک لفظ یا جملے میں ادا ہو جائیں یا کسی کردار کی ایک ذرا سی حرکت میں سما جائیں، یوں ناول کا تسلسل بھی

نہیں ٹوٹتا اور سماں ہے کہ بندھتا چلا جاتا ہے۔ اگر لکھنے والے میں یہ خوبی نہ ہو تو اُس کی کہانی واقعات اور اطلاعات کی بھرمار سے بوجھل ہو جاتی ہے۔ فاسٹر ۱۹۱۱ء میں پہلی بار ہندوستان آیا اور اُس کی تحریری یادداشت رکھ لی۔ گیارہ برس کے بعد وہ دوبارہ آیا تاکہ ناول کے لیے کچھ اور مواد جمع کر لے۔ اُس کے بعد وہ دو سال تک ایک ناول لکھتا رہا جسے A Passage to India کے عنوان سے شائع کیا اور سر راس مسعود کے نام معنون کر دیا۔ یہ انتساب برِّعظیم سے فاسٹر کے پہلے تعلّق کی یادگار ہے۔ ۱۹۰۶ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ کے پرنسپل سر تھیوڈور موریسن ایک نوجوان کو اپنے ہمراہ انگلستان لے گئے اور وہاں فاسٹر کو اُس کا اتالیق مقرّر کیا۔ شاگرد اور استاد کا رشتہ ایسی دوستی میں بدل گیا جو فاسٹر نے سر راس کے انتقال کے بعد بھی نباہی۔ جس روز کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس روز فاسٹر نے یونین ہال میں ایک تقریر بھی کی تھی۔ مُجھے اُس کا صرف ایک جملہ یاد ہے۔ فاسٹر نے کہا تھا کہ بمبئی کے ساحل پر ایک آرائشی دروازہ ہے جسے بابِ ہند (Gateway of India) کہتے ہیں۔ میرے لیے اس ملک کا صدر دروازہ وہ

خشت و سنگ کی سرد اور ہیجان عمارت نہیں بلکہ سر راس مسعود کی گرم جوش اور گرم خون شخصیت تھی۔ اس جملے پر اسے بہت داد ملی۔ فاسٹر نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جمہوریت کے لیے صرف دو بار تالی بجانا کافی ہے کیونکہ اس کی بدولت تنوّع اور تنقید کی دولت میسر آتی ہے۔ تین بار تالی Three Cheers سوائے اقلیمِ محبّت کے اور کسی کو سزاوار نہیں۔ جب فاسٹر نے محبّت سے سر راس کو یاد کیا تو یونین ہال دیر تک تالیوں کے شور سے گونجتا رہا اور سب کی نگاہیں سٹیج کے اس حصّے کی طرف اُٹھ گئیں جہاں راس مسعود کی روغنی رنگین تصویر آویزاں تھی۔ کچھ آنکھیں نم ہوئیں اور کچھ لوگ زیرِ لب یہ شعر پڑھنے لگے۔

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی

وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود

فاسٹر کو مسلمانوں کی جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی وہ اُن کی مسجدیں تھیں۔ اسے مسجد میں اسلام کی سادگی اور سلامتی کا پیغام بھی ملا اور خود فراموشی اور خدا شناسی

کا مقام بھی ان خانہ خدا نے اُس کے دِل میں گھر کر لیا، وہ کشاں کشاں وہاں پہنچ جاتا اور داخل ہوتے ہی اس پر ایک کیف طاری ہو جاتا۔ اس وارفتگی کا سب سے زیادہ لُطف اُس نے مسجدِ عمر (Mosque of Amr) میں اُٹھایا جس کے بارے میں اُس نے سُن رکھا تھا کہ وہاں چند صحابہ کرام آکر ٹھہرے تھے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اِن پاک ہستیوں کے قیام کی وجہ سے اس مسجد کی فضا میں ایک خوشبو بس گئی ہے جو آج تک برقرار ہے۔ فاسٹر کا دل بہت گداز تھا۔ وہ جب خواجہ نظام الدّین اولیاء کے مزار سے ننگے پاؤں باہر نکلا تو اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ ایک بار اُس نے جے پور جاتے ہوئے موٹر روکی اور سڑک کے کنارے ایک غیر آباد مسجد میں داخل ہو کر عالمِ خیال میں کھو گیا۔ فاسٹر کے مشہور ناول کے پہلے حصّے کا عنوان بھی مسجد ہے۔ اس ناول میں ایک کردار اُس انگریز سیّاح عورت کا ہے جو کلب میں اپنے ہم وطنوں کی خرافات اور فروعات سے اُکتا جاتی ہے تو کلب سے باہر نکل کر ٹہلتے ہوئے ساتھ والی مسجد میں داخل ہو جاتی ہے۔ کلب میں گھٹن ہوتی ہے اور صحن مسجد میں کشادگی۔ کلب میں سب کو جانتے ہوئے بھی بیگانگی کا

احساس ہوتا ہے اور مسجد میں سارے ناواقف ہوں تو پھر بھی اپنے معلوم ہوتے ہیں۔ مسقف میں داخل ہوں تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے اپنی پناہ میں لے لیا ہو۔ محراب کے سامنے کھڑے ہوں تو حضوری کا لطف آنے لگتا ہے۔ ناول کے کردار نے مسجد میں اسماءِ حسنہ لکھے ہوئے دیکھے تو ایک نقش اُس کے دل پر بھی ثبت ہو گیا۔

اس ناول میں برِّ عظیم اپنے سارے مسائل کے ساتھ بکھرا ہوا ہے۔ یہ سارے مسائل جن میں سے بہت سے محض نفسیاتی میں فاسٹر نے بڑی محنت سے سمیٹ کر یکجا کیے ہیں۔ مگر ناول ختم کیجئے تو وہ بکھر جاتے ہیں اور یہی لکھنے والے کا منشا تھا۔ اس ناول میں تصویر کے دو رُخ بھی ہیں اور مثلث کے تین زاویے بھی۔ انگلستان مالک اور ہندوستان غلام ہے اور اس غلام ہندوستان میں تین اکائیاں ہیں یعنی انگریز، ہندو اور مسلمان۔ ایک برخود غلط دوسرا تہ دار اور تیسرا ایک کھلی بیاض۔ مسلمانوں کو شعر کا لپکا ہے، وہ حافظؔ، غالبؔ، حالیؔ اور اقبال کے اشعار پڑھتے اور سر دُھنتے ہیں۔ مسلمانوں کو اسلام محبوب ہے اور حسن مرغوب، وہ ایک کے

زوال اور دوسرے کے وصال کی فکر میں گھلتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عزیز کی یہ حسرت کہ وہ اورنگ زیب عالمگیر کے لشکر میں شامل ہوتا، دراصل شاعری اور تاریخ کے گڈ مڈ ہو جانے سے پیدا ہوئی تھی۔ انگریز افسر کا اس ناول میں خوب مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس افسر کے اجزائے ترکیبی میں پبلک سکول کی تعلیم، لندن یونیورسٹی کا قیام، مقابلے کے امتحان میں کامیابی، صوبے میں تعیناتی، درجہ بدرجہ ترقّی، ایک بار گھوڑے سے گرنا اور ایک بار میعادی بخار میں مبتلا ہونا شامل ہے جو اُس میعادی بخار سے شرفیاب ہو گیا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس بیماری میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ ہم چو ما دیگرے نیست۔ نوجوان انگریز افسر اپنے وطن سے بالکل ایک عام آدمی کی طرح روانہ ہوتا ہے مگر نہر سویز سے گزرنے کے بعد اس میں تبدیلی آنے لگتی ہے، یہاں تک کہ چند دِن غلام ہندوستان میں گزارنے کے بعد وہ ایک خاص مخلوق میں بدل جاتا ہے۔ ایک سیدھے سادے پڑھے لکھے نوجوان کی جگہ ایک خود پرست، لاتعلق اور بے حس افسر لے لیتا ہے۔ بدن چُست، ذہن چالاک مگر قلب نا آراستہ۔ سول لائنز اس کی دنیا اور کلب اُس کی کائنات

ہے۔ بقول فاسٹر وہ ایک انسان نہیں بلکہ ایک بیگانہ رویہ اور ایک قطعی فیصلہ بن کر رہتا ہے۔ یہ انگریز افسر محکوم آبادی کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اُن کو سمجھنے کی کوشش میں ہمیشہ غلط رُخ پر دور تک اپنے تعصبات کے تعاقب میں نکل جاتے ہیں۔ ایک صدی کے تجربے کے بعد وہ اِس مضحکہ خیز حکمت عملی پر قائم ہیں کہ یہاں نہ خوش اخلاقی میں کوئی مضائقہ ہے اور نہ زنا میں کوئی قباحت، البتّہ مقامیوں سے بے تکلّف ہونا ایک سماجی بُرائی اور ایک سیاسی سازش ہے۔

فاسٹر کو حاکم کے یہاں تضاد اور محکوم کے یہاں تذبذب نظر آتا ہے۔ وہ ان دونوں کیفیات پر ہنستا ہے وہ روز مرّہ زندگی سے عام واقعات اور معمولی باتوں کو منتخب کرتا اور یوں پیش کرتا ہے کہ وہ علامتی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی غلام ہندوستانی کو اپنے انگریز آقا کا ناوقت بلاوا آتا ہے تو وہ پہلے اپنے ساتھیوں کے سامنے ڈینگیں مارتا ہے کہ اُسے ایسے پیغامات کی ہرگز کوئی پروا نہیں ہے اور جب ساتھیوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو تیز تیز سائیکل

چلاتا ہے تاکہ افسر کی توقع سے پہلے پہنچ کر اُس کی خوشنودی حاصل کرے۔ یہی شخص اگر انگریز افسر کے بنگلے پر تانگے میں سوار ہو کر جارہا ہو تو دور ہی سے اُس کے دِل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ تانگہ کوٹھی کے اندر لے جائے گا یا باہر اُتر کر پیدل اندر داخل ہو گا۔ بغاوت اور خوشامد میں مصلحت نے یوں صلح کرائی کہ وہ تانگہ بنگلے میں لے گیا مگر برآمدے سے دُور اندھیرے میں اُس کو روک دیا۔ بغاوت یا خوشامد یا مصلحت میں کسی ایک طریق پر قائم نہ رہنے کی وجہ سے مقامی کردار الجھن کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن مختلف ہیں اور ظاہر میں بھی بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہاں گری ہوئی حرکتیں، بے حد شکائتیں اور ادنیٰ سازشیں عام ہیں۔ جو دِل کا حال ہے وہی باہر کا حال ہے۔ دفتر میں جابجا سیاہی کے چھینٹے، گھر میں پیک کے داغ اور سڑک پر گنڈیری کے چھلکے پھیلے ہوئے ہیں۔ زبان ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ اس کی مصروفیت کی وجہ حرفِ شکایت یا محض لاف زنی۔ یہ عجیب نرالے اور پُر اسرار لوگ ہیں۔ جب اُن میں سے کوئی اِس بات کا ذکر کرتا ہے کہ وہ بے حد ناخوش اور بیزار ہے تو دِل ہی دِل میں اُس پر بڑا

خوش ہوتا ہے۔ وہ ناخوشی کے اظہار میں بھی اپنی برتری کا پہلو ڈھونڈ لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کو نہ اپنے احساسات کا ادراک ہوتا ہے اور نہ اپنی خواہشات کا صحیح علم۔ مثال کے طور پر غلام ہندوستانی اپنے گھریلو ملازم کو آواز دیتا ہے اور نوکر کبھی کبھی سُنی اَن سُنی کر دیتا ہے، مالک یہ جانتے ہوئے کہ نوکر لاپرواہی کر رہا ہے یوں خاموش ہو جاتا ہے جیسے اُس نے نوکر کو نہ کبھی آواز دی ہو اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی ہو۔ تعلّق اور بے تکلّفی کا یہ رشتہ بظاہر مقامی مالک اور نوکر کے درمیان نظر آتا ہے مگر یہ رشتہ تو اُس ملک میں فاتح اور مفتوح کے درمیان ہمیشہ سے قائم ہے۔ انگلستان نے ہندوستان کو فتح کیا مگر اُسے سمجھ نہ سکا۔ فاسٹر نے اُس کے بارے میں کہانی لکھی اور بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اُس نے لکھا ہے۔ "ایسے ملک کو بھلا کوئی کیا سمجھے گا۔ حملہ آوروں کی کئی نسلوں نے یہ کوشش کی مگر وہ اتنی مدّت گزرنے کے باوجود ابھی تک اجنبی ہیں۔ بڑے بڑے شہر جو اُن حملہ آوروں نے آباد کیے وہ تو محض اُن کی پناہ گاہ ہیں۔ اُن کی لڑائیاں اور معرکے اِس گروہ کے برپا کئے ہوئے ہنگامے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جو گھر کا راستہ

بھول گیا ہو۔ ہندوستان کو حملہ آوروں کی اِس بے بسی کا علم ہے۔ اُسے تو دنیا بھر کے دکھوں کی خبر ہے۔ وہ پکارتا ہے "آؤ" اور سو طرح سے پکارتا ہے "آؤ۔" یہ صدا یہاں کی ہر شے سے بُلند ہوتی ہے خواہ وہ حقیر ہو یا عظیم لیکن کس کے پاس آؤ، یہ بات اُس نے کبھی واضح نہیں کی۔ یہ ملک ایک پیمان نہیں محض ایک پکار ہے۔"

میں نے ناول ختم کیا تو یوں لگا گویا یہ کسی صوفی فلسفی اور عاشق کی لکھی ہوئی مثنوی ہے۔ محض ادیب اور ناول نگار اِن بُلندیوں تک کہاں پہنچتا ہے۔

آخری دِنوں فاسٹر کی ملازمت بڑی انوکھی تھی۔ وہ کیمبرج میں رہتے تھے اور یونیورسٹی کی طرف سے اُن کو صرف اس بات کی تنخواہ ملتی کہ جب کوئی چاہے اُن کے دروازے پر دستک دے اور اُن سے گفتگو کر لے۔ کچھ حیثیت چڑیا گھر کے شیر کی تھی کہ بچّے جب چاہیں آکر دیکھ لیں اور کچھ حیثیت سبیل کی تھی کہ پیاسے جب چاہیں آکر پیاس بجھائیں۔ علامہ اقبال کے آخری سال بھی اسی طرح گذرے تھے۔ جس نے چاہا علی بخش کو آواز دی اور حاضر ہو گیا۔ لارڈ لو تھین

حاضر ہوئے تو شرفِ باریابی دینے والا بنیان اور تہمد میں ملبوس تھا۔ بڑے آدمی وہی اچھے ہوتے ہیں جو اپنے کام میں مصروف ہوں تو سو پردوں میں پوشیدہ رہیں اور جب فارغ ہوں تو سارے حجابات دور ہو جائیں اور یارانِ نکتہ داں کے لیے صلائے عام بن جائیں۔ میں نے ایک بار اِسی خیال میں مگن ہو کر ایک مصوّر کے گھر دستک دی۔ اُن کے بجائے ایک اور شخص بر آمد ہوا اور میرے شوق اور مصوّر کی ذات کے درمیان ہمیشہ کے لیے حائل ہو گیا۔ بڑے آدمیوں کے گرد ایسے چھوٹے آدمی اکثر جمع ہو جاتے ہیں خود فیض کے اہل نہیں ہوتے اور دوسروں کو محروم کرتے ہیں۔ فاسٹر کی ذات کے گرد کوئی کم ظرف اجارہ دار نہ تھا، اس کے پاس ہر عمر اور ہر قسم کے لوگ بلا روک ٹوک آتے جاتے اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا۔ اس نے ایک بار شکوہ کیا کہ اُس کے پاس آنے والوں میں باتیں بنانے والے تو بہت ہیں مگر خوش گُفتار کم یاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک روز میں اور ابنِ حسن برنی گُل افشانیِ گُفتار کی تلاش میں کراچی کی سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے اور کئی بار راستہ بھول کر اور نگی ہلز کے قریب اُس گھر

پر جا پہنچے جس کے باہر ایک تختی پر لکھا تھا:

مُلّا واحدی

(۴)

مُلّا واحدی کے تین امتیازات ہیں، عبارت، ادارت اور رفاقت۔ ان کی عبارت میں ستّر برس کی مشق اور مہارت شامل ہے۔ ادارت کا یہ حال ہے کہ ایک وقت وہ اکٹھے نو رسائل کے مدیر اور مہتمم تھے۔ اُن کے دوسرے رسالے اور اخبار نہ جانے کتنی دیر چلے مگر ایک سخت جان ماہ نامہ وہ پچاس برس تک باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ جہاں تک رفاقت کا تعلق ہے اس کے دعوے دار ہیں، شہروں میں دِلّی اور انسانوں میں خواجہ حسن نظامی۔ ایک واحدی صاحب کا ساتھ چھوڑ گئے اور دوسرے کو واحدی صاحب نے خود چھوڑ دیا۔

آزادی سے پہلے مُلّا واحدی کا نام سُن رکھا تھا۔ یہ نام اتنا انوکھا لگا کہ وجہ تسمیہ پوچھنی پڑی۔ معلوم ہوا کہ یہ نام نہیں لقب ہے۔ پیر و مُرشد کے عطا کیے ہوئے

لقب کی شہرت نے وہ گرد اُٹھائی کہ سیّد محمد ارتضےٰ کا اصلی نام اس غبار میں گم ہو گیا۔ واحدی صاحب کی ناموری میں کچھ دخل اُن کے اصلی نام کی گمنامی کو بھی حاصل ہے۔ واحدی صاحب کو نیا بام ہی نہیں بلکہ ایک نئی شخصیت خواجہ حسن نظامی کی توجّہ سے حاصل ہوئی۔ یہ ایک دل برداشتہ نوجوان کی حیثیت سے ایک پُراعتماد اور اُبھرتی ہوئی ہستی سے ملے۔ ہم عمر اور ہم مشرب تھے باہم مل بیٹھے اور عمر بھر کا ساتھ ہو گیا۔ دیکھنے والے اِس کامیاب دوستی پر حیران ہوئے۔ ایک کم آمیز، کم گو اور پس منظر میں رہنے والا۔ دوسرا مجلسی، طوفانی اور شوخ قلم۔ ایک سراسر منادی، دوسرا محض تاثرات۔ دیکھنے والوں کی نظر عادات پر گئی یا طبیعت پر، خواص اور جوہر اُن کی نظر سے اوجھل رہے۔ دونوں میں وضعداری تھی، اسلام، اُردُو اور دِلّی سے محبّت تھی، اَن تھک محنت سے اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور آگے بڑھنے کی امنگ تھی۔ دونوں کے دیرپا تعلقات کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ خواجہ حسن نظامی نے انہیں کبھی مدِّمُقابل نہ سمجھا اور مُلّا واحدی نے انہیں کبھی روائتی پیر نہ مانا۔ یا اگر مقابلہ کرتے تو ہار جاتے اور اگر نِرے مرید ہو

جاتے تو مُلّا واحدی نہ بن سکتے جو بذاتِ خود ایک قابلِ قدر زندگی کا نام ہے۔

نوائے وقت میں جب تاثرات کے عنوان سے واحدی صاحب کا کالم چھپنے لگا تو پہلا کالم پڑھتے ہی دِل مچل گیا اور واحدی صاحب کو جاننے اور اُن سے ملنے کی خواہش بھی پیدا ہو گئی۔ اکثر تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ مصنّف کی ذات اُن میں ڈھکی چھپی رہتی ہے اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ مصنّف کو اُن سے علیحدہ کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ واحدی صاحب اپنی تحریروں میں نمایاں رہتے ہیں۔ اُن کی تحریر ایک طرزِ نگارش سے زیادہ ایک طرزِ حیات سے عبارت ہے۔ مُغلیہ تہذیب کی وراثت، خاندانی شرافت کا سرمایہ، مرشد کی خاص عنایت، مشاہیر سے ہر وقت کا تعلّق، لکھنے پڑھنے کا شوق اور کاروبارِ محبّت کی عادت، معاملگی کی دیانت، عہد کا پاس، عروس البلاد سے وابستگی، دین کا ذوق، حضورؐ کی محبّت اور خدائے بزرگ و برتر کے فضل و کرم پر ایمانِ کامل حاصل ہو تو لکھنے والے کی ذات تحریر کے ہر لفظ اور فکر کے ہر انداز میں جھلکتی ہے۔ ساری عمر ایک خاص ڈھب سے بسر ہو تو سوچ کا یہ ہمہ گیر مگر پختہ اور یکساں انداز نصیب ہوتا ہے۔

تاثرات سہل اور دل نشیں عبارت کے چھوٹے چھوٹے پارے ہیں۔ زبان سلیس اور سادہ اتنی کہ پڑھنے میں روانی کا مزہ ملتا ہے اور مُشکل اتنی کہ اِسی طرز میں لکھنا چاہیں تو بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا نکتہ ہو یا نازک سے نازک مقام اِس عبارت کی سادگی میں فرق نہیں آتا اور معنی آفرینی کا حق بھی پوری طرح ادا ہو جاتا ہے۔ واحدی صاحب اپنی تحریر کا مقابلہ اپنے محلّے کے شبیر قوّال سے کرتے ہیں کہ پھٹی پھٹی آواز تھی مگر جان لگا کر برسوں تک گاتا رہا یہاں تک کہ اُستاد مانا گیا۔ سہل عبارت کا یہ نسخہ بڑا مُشکل ہے کیونکہ شبیر قوّال کی لگن اور کبھی ہار نہ ماننے کا جذبہ ہر ایک کے حصّے نہیں آتا۔ واحدی صاحب نے شبیر قوّال کے حوالے سے عزم کی اہمیت اور محنت کی ضرورت کے بارے میں جو ہلکا پھلکا اشارہ کیا ہے اُس کی سند وہ تیمور کی زندگی یا نپولین کے اقوال سے بھی لا سکتے تھے اور کچھ مفرّس اور معرّب تراکیب سے اس دلیل کو وزنی بنا سکتے تھے۔ مگر وہ لگی لپٹی بات کہنے کے قائل نہیں۔ وہ سادہ لکھنے اور سچ بولنے کے عادی ہیں۔ سچ کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اس لیے اُس کی مثالیں لانے کے لیے انھیں دِلّی

سے باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ سچ کا یہ سفر اُن کی فکر کی کشادہ راہوں پر طے ہوتا ہے یا پرانی دِلّی کے تنگ گلی کوچوں میں۔ تاثرات کی عبارت کہانی کی طرح شروع ہوتی ہے اور چند سطروں میں جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں جاکر ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں پلاٹ، پس منظر اور کردار نگاری مکمل ہوتی ہے مگر اس کے لیے بے رابط ناولوں کی سی طوالت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ ایک لفظ، ایک اشارے یا ایک ایک سطر میں ایک پوری داستان سمو کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اُن کی مختصر نویسی کا یہ کمال ہے کہ ہر منظر مکمّل لگتا ہے اور ہر بات مفصّل معلوم ہوتی ہے۔ تاثرات کی ابتدا کسی معمولی بات سے ہوتی ہے جو آخر تک پہنچتے ہی غیر معمولی بن جاتی ہے۔ پڑھنے والا چونک اُٹھتا ہے کہ غیر اہم اور اہم کا درمیانی سفر اتنا مُختصر کیسے ہو گیا۔ واحدی صاحب کا راز یہ ہے کہ وہ اس فاصلے کو عام روش سے ہٹ کر ایک متروک پگڈنڈی کے ذریعے طے کرتے ہیں جسے بے راہ روی کی طویل راہیں دریافت کرنے سے پہلے صراطِ مُستقیم کہتے تھے۔ ایک بار میں تاثرات پڑھتے ہوئے اس لئے چونک اُٹھا کہ مجھے اس پگڈنڈی

پر مُلّا واحدی کے ساتھ مولانا عبد الماجد دریا آبادی کا سایہ نظر آیا۔ تاثرات کے پہلے مجموعے کا تعارف مولانا عبد الماجد نے لکھا ہے اور اس کا حق انہیں یوں بھی پہنچتا ہے کہ تاثرات کا رشتہ فکر اور تحریر میں اُن چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے جا ملتا ہے جو صدق میں سچی باتوں کے عنوان سے چھپتے رہے ہیں۔ دونوں کا پیغام ایک ہے مگر مزاج اور ماحول مختلف ہے۔ سچی باتیں اکثر کڑوی ہوتی ہیں۔ مولانا طنز اور تلخی سے ایک ایسا تقابل پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا خود کہہ اُٹھے، ببیں تفاوت رااز کجا است تا بکجا۔ مُلّا صاحب کے یہاں شیریں بیانی ملتی ہے اور پیار سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مولانا ایک تنگ نظر اکثریت کے بوجھ تلے دبی ہوئی بدحواس اقلیت کی نحیف آواز میں اور مُلّا صاحب ایک نظریاتی ملک کی بھٹکی ہوئی اکثریت کے نقّار خانے میں طوطی کی آواز۔ سچی باتیں ایک احتجاج ہیں اور تاثرات خود احتسابی کی ایک کوشش۔

تاثرات کی پہلی جلد اہتمام سے شائع ہوئی مگر اُس کی ترتیب اور تدوین سے اُس کے تاثر میں کمی آ گئی ہے۔ تاثرات چھوٹے چھوٹے نثری پاروں پر مشتمل ہے۔

ہر ٹکڑا ایک اکائی ہے اور اس کا کوئی عنوان نہیں، کتاب میں ہر تاثر کو دو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اُن کے مُستقل عنوانات قائم کر دیے ہیں۔ رابطہ غلط ملط ہو گیا ہے۔ بات ادھوری رہ گئی ہے اور کتاب پر پند نامے کا گمان گزرتا ہے۔ میں نے اِس کا ذکر واحدی صاحب سے کیا تو فرمایا کہ اپنی رائے سے حکیم سعید صاحب کو مطلع کر دیں۔ کتاب چھپ چکی تھی۔ میں خاموش ہو رہا۔ اب تاثرات ہاتھ میں لیتا ہوں تو کسی کا یہ مقولہ یاد آ جاتا ہے کہ اگر ایک بے بہا جذبے کو عنوان دے دیا جائے تو اُس کی قیمت گر جاتی ہے۔

واحدی صاحب سے میری وابستگی تاثرات کے قاری کی حیثیت سے قائم ہوئی مگر اُن سے ایک ملاقات کے بعد معاملہ پیوستگی تک جا پہنچا۔ میں ایک ادیب سے ملنے گیا اور ایک بزرگ سے ملاقات ہو گئی۔ مفلوج جسم میں ایک صحت مند ذہن ضعیفی میں جواں ہمتی، بستر علالت پر ایک سرگرمِ عمل زندگی۔ انہیں دِنوں مجھے ایک بیمار بوڑھے اور نامی شاعر سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ میں ان دونوں بیماروں کا مقابلہ کرنے لگا۔ ایک سراپا شکر کی تصویر تھا اور دوسرا سراسر شکوہ۔ واحدی

صاحب کی قدر کچھ اور بڑھ گئی۔ ادھر گنتی کی چند ملاقاتیں ہوئیں اُدھر ہر ملاقات میں اُن کی شفقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میرے پاس اُن کی شفقت کا تحریری ثبوت اُن کے دو تین خطوں کی صورت میں موجود ہے مگر اُن کی ایک تحریر کے حوالے سے مجھے اُن کی ناراضگی سے بھی کچھ حصّہ ملا ہے۔ واحدی صاحب نے میری قلم کاری کی مختصر کہانی میں لکھا ہے کہ نظام المشائخ باون برس کے بعد ۱۹۲۰ء میں اس وقت بند ہوا جب تمام اخبارات سے مارشل لاء کے تحت نئے ڈیکلریشن مانگے گئے۔ شاید وہ صاحب جو ڈیکلریشن منظور کرنے بیٹھے تھے اُن کے ذوق نے اِسے گوارا نہیں کیا۔ نظام المشائخ واحدی صاحب کی صحافتی زندگی کا نقشِ اوّل خواجہ حسن نظامی کی یادگار اور کتابوں کی تیّاری کا ذریعہ تھا۔ اس کا بند ہونا ایک حادثے سے کم نہ تھا مگر وہ اس حادثے پر بھی خُدا کا شکر بجالائے کہ خود رسالہ بند کرنے اور وضع کو توڑنے کے مجرم نہیں ہوئے۔ مجھے موقع ہی نہیں ملا کہ واحدی صاحب کو بتا سکوں کہ نظام المشائخ کے ڈیکلریشن کو نامنظور کرنے والے حکم پر میرے دستخط ہوئے تھے۔ اس حکم کی وجہ ذوق کی وہ کمی نہیں جس

کی طرف واحدی صاحب نے اشارہ کیا ہے بلکہ وہ زیادتی ہے جو اس وقت کے قانون نے اخبارات پر روا رکھی۔ نظام المشائخ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اپنی مالی حالت کی وجہ سے نیا اجازت نامہ حاصل نہ کر سکا۔ قانون بنانے والوں کی نیّت میں بے شک فتور تھا مگر اُس کے تحت جو احکامات دیے گئے اُن میں ذوق کا نہیں ضابطے کا قصور تھا۔

واحدی صاحب کی زندگی میں کوئی تصنّع نہیں، جو سوچتے ہیں وہی کہتے اور لکھتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ وضع داری کا یہ عالم ہے کہ پچاسی برس کی عمر اور فالج کے باوجود ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں ووٹ ڈالنے گئے۔ رائے شماری چونکہ خفیہ تھی، اِس لیے جس اُمّیدوار کو ووٹ دیا اُس کا نام نہیں بتاتے صرف اتنا اشارہ کیا کہ جس اُمّیدوار کو ووٹ دیا تھا وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ان انتخابات میں عوامی لیگ کو کامیابی ہوئی اور یہ نتیجہ مغربی پاکستان کے لیے مایوسی کا باعث ہوا۔ خیال تھا کہ واحدی صاحب بھی مایوس ہوئے ہوں گے مگر ان کی رائے سُنی تو پتہ چلا کہ وہ تازہ فکر اور جوان ذہن رکھتے ہیں، کہنے لگے کہ مشرقی پاکستان میں جو

حقیقت سامنے آئی ہے اس سے انکار مضر اور مخالفت بے اثر ہو گی، اب تو ان کے ساتھ مل کر کام کرنا اور انہیں بعض کاموں سے روکنا ہو گا تا کہ اس صورت میں خیر کے سامان پیدا ہو جائیں۔ اخبار میں ایک مختصر خط ملک کے حالات پر لکھا جس میں درج تھا کہ شیخ مجیب تک میری آواز پہنچے یا نہ پہنچے کم از کم مجیب الدعوات تو سب کی سنتا ہے بس اُسی سے دعا ہے کہ جنہیں کامیابی دی ہے انہیں خیر کی توفیق بھی عطا کر۔ ہمارے گناہوں کا بوجھ اتنا ہے کہ دعا قبول نہ ہوئی اور ملک دو نیم ہو گیا۔

واحدی صاحب نے شادیاں تین کیں مگر عشق صرف دِلّی سے کیا۔ اُن کے اس عشق کا حال اس وقت کھلا جب وہ دِلّی کے فسادات کے بعد مہاجر ہو کر ہجر و فراق کی اس منزل پر آ پہنچے جو بزرٹا لائن کراچی کا آباد ہونے والا پہلا کوارٹر تھا۔ واحدی صاحب نے دِلّی کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ گاہے گاہے اُن کے مضمون چھپنے لگے اور چند برس کے بعد اُس موضوع پر اُن کا ایک مجموعہ شائع ہو گیا۔ اس کتاب کو دِلّی کے اس دور پر جس سے متعلّق ہے ایک دستاویز کی حیثیت

حاصل ہے۔ یہ شہرِ آشوب یا مرثیہ نہیں ہے۔ اِس کا انداز ہائے دِلّی کا نہیں بلکہ واہ دِلّی کا ہے۔ عاشق نے دوری کے غم اور مہجوری کے درد کو عشق کی توہین سمجھتے ہوئے اپنے فراق کو وصل و پیار کی اِس کہانی سے بہلایا ہے جو کبھی اس کے شب و روز کا حصّہ تھی۔ یوں تو بھارت کے ہر شہر سے مسلمان مہاجر جان بچا کر پاکستان آئے اور ان شہروں کی خوشبو اور یادوں کو ہمراہ لائے مگر تذکرہ لکھنے کا وقت آیا تو سوائے دہلی اور حیدر آباد دکن کے باقی شہروں کو لوگ بھول گئے۔ حیدر آباد کو بھی کوئی ملّا واحدی، شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، خواجہ محمد شفیع یا خیری خاندان نہ مل سکا۔

ملا واحدی کے یہاں بات سے بات نکلتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ ان کی عمر ۸۵ برس کی ہو گی۔ بچپن میں بزرگوں کی آنکھیں دیکھیں اور ان کی باتوں پر کان دھرا اس لئے ان کی گفتگو سے پوری ایک صدی روشن ہو جاتی ہے۔ گفتگو میں کتنے ہی پیچ کیوں نہ پڑ جائیں اور موضوع کہیں سے کہیں کیوں نہ نکل جائے، واحدی صاحب کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوتی۔ مطالعہ اور مشاہدہ ایک طرف حافظہ

اور بیان دوسری طرف سننے والا بھی اس پر حیران ہوتا ہے اور بھی اس پر نہ حیرت ختم ہوتی ہے اور نہ بات ختم ہونے میں آتی ہے۔ بیان کا انداز یہ ہے کہ وہ بات کا ایک سرا لے کر دائرہ بناتے ہیں پھر دوسرا سرا اس دائرے سے گزار کر گرہ لگاتے ہیں، سُننے والا بھی بات گرہ میں باندھ لیتا ہے۔ ایک روز کسی بات کے دوران علما کا ذکر آ گیا۔ واحدی صاحب اس گروہ کی خشک مزاجی، ادب سے لگاؤ کی کمی اور متشدّد اور غیر متوازن طبع کا ذکر کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

"دو آدمی میں نے اپنی زندگی میں بڑی متوازن طبیعت کے دیکھے ہیں، ایک مفتی کفایت اللہ اور دوسرے حکیم اجمل خاں۔ مفتی صاحب اس معاملے میں حکیم صاحب سے بھی بازی لے گئے تھے۔ مفتی کفایت اللہ جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر تھے، قوم پرست اور کانگرسی تھے مگر حالات کی رفتار پر نظر رکھتے۔ نئ صورتِ حال کے بارے میں اُن کی رائے میں ہمیشہ توازن ہوتا۔ ان کے ساتھیوں میں یہ خوبی تھی۔ مولانا احمد سعید اور مولانا حفظ الرحمان سیہواری دونوں کی طبیعتیں مفتی صاحب سے مختلف تھیں مولانا احمد سعید وغیرہ سیاسی

مخالفت میں مبالغے سے کام لیتے ہوئے اتنا آگے نکل گئے کہ حقیقت پسندی کے سارے تقاضے پسِ پُشت ڈال دیے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے شہر کے رہنے والے اور ان کو جاننے والے پاکستان میں انہیں بھی اچھے الفاظ سے یاد نہیں کرتے۔

مجھے پاکستان آنے کے بعد ایک بار مولانا احمد سعید کا خط ملا۔ دہلی کے موسم کا حال لکھا تھا کہ دو دو ہیٹر جلانے کے باوجود سردی لگتی ہے۔ میں نے جواب میں انہیں لکھا کہ کراچی کی سب سے بڑی خوبی اس کا موسم ہے۔ اِس میں توازن پایا جاتا ہے، شدّت بالکل نہیں رکھتا۔ آپ کا خط جس وقت ملا میں اُس وقت ایک دہری بنیان اور کُرتے میں بیٹھا تھا۔ یہاں کی گرمی گوارا، سردی گلابی اور برسات بالکل خُشک ہوتی ہے۔ بارشیں البتّہ جی چاہتا تھا ذرا زیادہ ہوں مگر اُن کی وجہ سے جھگی نشینوں کو جو تکلیف ہوتی تھی اس کی خاطر بارش کی کمی کو بھی غنیمت جانا۔ مگر یہ تو شروع کے دِنوں کا حال ہے، اب ہمارے گناہوں نے کراچی کے موسم کو بدل کر رکھ دیا ہے گرمی میں پارہ ایک سو دس ڈگری تک چڑھ جاتا ہے، سردی میں کوئٹہ سے سرد لہر چلتی ہے تو کراچی آ نکلتی ہے، برسات میں ساری نئی بستیاں ڈوب جاتی

ہیں۔ کراچی کے موسم کا توازن کیا بگڑا کہ سبھی کچھ بگڑ گیا۔ اب تو سنا ہے اسلام آباد میں بھی گرمی ۱۱۸ ڈگری تک ہو جاتی ہے۔ بات میں مفتی کفایت اللہ کی متوازن طبیعت کی کر رہا تھا۔ مفتی صاحب دیو بند کے تھے، سعید احمد حفظ الرحمان، اور جمعیت کے دوسرے اکابر بھی اس مدرسے کے تھے۔ دیو بند پر خواہ خواہ کانگرس کی چھاپ لگ گئی۔ حالانکہ یہ مدرسہ ولی اللّٰہی تحریک کا ثمر تھا۔ مسلم یونیورسٹی اور دار العلوم میں بھی ٹھن گئی۔ دین اور سیاست میں دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں حالانکہ ان دونوں درس گاہوں کے بانی یعنی سر سیّد احمد خاں اور مولانا قاسم نانوتوی ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ دونوں نے دہلی میں جس استاد سے پڑھا ہے ان کا نام مملوک علی تھا۔ ویسے مملوک العلی بھی درست ہے۔ قاسم نانوتوی تو ہندوستان سے ہجرت کر چکے تھے مگر مکّہ معظمہ سے واپس بلائے گئے۔ شروع میں علی گڑھ اور دیو بند کے مدارس میں طلبا کے باہمی تبادلے کا رواج بھی تھا۔ میں ایک شخص انیس احمد نامی کو جانتا ہوں جنہیں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے دور میں علی گڑھ سے گریجویٹ ہونے کے بعد اس سکیم کے تحت دیو بند

بھیجا گیا جہاں انہوں نے درس نظامی مکمل کیا۔ اگر یہ روایت جاری رہتی اور دونوں ادارے ایک دوسرے کے نزدیک آ جاتے تو خوب ہوتا۔ اس قسم کے اشتراک کے لیے جس طرح کی عالی ظرفی اور متوازن طبیعت چاہیے وہ عام نہیں، دیوبند میں بڑے بڑے صاحب علم و کمال گزرے ہیں۔ ادب سے ان کا زیادہ تعلق نہیں رہا۔ آپ نے شیخ الہند کے ترجمہ قرآن پاک پر شبیر احمد عثانی کے حاشیے دیکھے ہوں گے، زبان کے لحاظ سے بہت معمولی ہیں۔ اشرف علی تھانوی بہت باکمال بزرگ تھے مگر تھانہ بھون زبان اور محاورے کے لیے سند نہیں ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے ایک بار منادی میں معافی نامہ شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ میں مولوی اشرف علی تھانوی سے اس بات کی معافی مانگتا ہوں کہ میں نے بہشتی زیور پر فحش نگاری کی تہمت رکھی تھی مگر میں اپنی اس رائے کے لئے معافی نہیں مانگ سکتا کہ انہیں اُردُو لکھنی نہیں آتی۔ علما میں زبان پر ادیبانہ قدرت صرف نذیر احمد کو حاصل تھی۔ بے حد محنتی اور ذہین تھے۔ محض مولوی نذیر احمد نہ تھے بلکہ ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ لہٰذا علما نے انہیں مان کر نہ دیا۔ اگر

زندگی مولوی کی سی بسر کرتے تو علما کو مانتے ہی بن پڑتی، ویسے نذیر احمد کے مزاج میں شوخی تھی۔ میں نے کہیں لکھا ہے کہ نذیر احمد ادب کی خاطر دین سے بے ادبی کر جاتے تھے، ان کے ترجمے کے بعض مقامات محلِ نظر ہیں۔ سارے دیو بندی تراجم شاہ رفیع الدّین اور شاہ عبد القادر کے تراجم کو سامنے رکھ کر کیے گئے ہیں۔ شاہ رفیع الدّین نے لفظی ترجمہ کیا اور ان کے بھائی نے بامحاورہ۔ اُردُو کے محاورے بدلتے رہتے ہیں اور نئے ترجمے ہوتے رہتے ہیں۔ ویسے شاہ ولی اللہ کی دور رَس نظر نے دیکھ لیا تھا کہ عربی میں عام مسلمانوں کی استعداد اتنی تیزی سے کم ہو رہی ہے کہ اس کے لیے مروّجہ زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ہونا چاہیئے۔ تراجم کا سلسلہ پہلے فارسی اور پھر اُردُو میں اس خطرے کے پیشِ نظر شروع ہوا کہ ہم عربی سے دور ہوتے جا رہے ہیں، اب کیفیت یہ ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ آج کی زبان کیا ہے اور کل کی زبان کیا ہو گی، ترجمہ کریں تو کیسے اور کچھ لکھیں تو کیوں کر۔ بات مفتی کفایت اللہ کی ہو رہی تھی۔ آپ نے دِلّی تو دیکھی ہو گی۔ دِلّی دروازے کے بائیں جانب محلہ در محلہ مسلمانوں کی آبادی تھی اور بائیں طرف

ہندو آباد تھے۔ ہندوؤں کے حصّے میں صرف تین مسلمان رہتے تھے، ایک ممتاز علی رئیس جو نوّاب اسماعیل کے رشتہ دار تھے۔ بس ایک کوٹھی فیض بازار کے اس طرف بنائی تھی۔ دوسری کوٹھی ڈاکٹر انصاری کی تھی جس میں انجمن ترقیٔ اُردُو کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ انجمن کو ان دِنوں وہاں کون گھُسنے دیتا، وہ تو مسلمان کا مکان تھا اس لیے ہندو کچھ نہ کہہ سکے۔ تیسرا مسلمان جو وہاں رہتا تھا وہ جوش صاحب تھے۔ وہ کبھی کبھی میرے یہاں آتے، اُن کے ساتھ ہمیشہ آزاد انصاری ہوتے جو خود بھی شاعر تھے۔ جوش کیسے اس حصّے میں آباد ہوئے اور کیا کام کیا کرتے تھے اس کا مجھے علم نہیں۔ دہلی میں مکان پرانی طرز کے ہوا کرتے تھے اگرچہ بالا خانوں کا رواج تھا مگر جدید طرز کے رہائشی فلیٹ ابھی استعمال میں نہ آئے تھے۔ ہندوؤں نے اپنے حصّے میں پہلی بار کچھ فلیٹ بنائے جن کے نئے پن کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں نے بھی انہیں کرائے پر لینا چاہا۔ ان میں میرے بھانجے فرید بھی شامل تھے۔ فرید سرکاری ملازم تھے۔ ہندوؤں نے انہیں بھی انکار کر دیا۔ فرید کی حلال خوری ہندوؤں کے ان فلیٹوں میں بھی کام کرتی تھی۔

اس نے مالکوں سے کہا، آپ فرید کو کیوں آباد نہیں کرتے وہ تو ماس بھی نہیں کھاتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ فرید کو بچپن ہی سے گوشت سے اجتناب ہے اور وہ سبزیاں کھاتا ہے۔ مالکوں نے جواب دیا فرید تو ماس نہیں کھائے گا۔ مگر کیا اس کے گھر والے اور اس کے گھر آنے والے بھی نہیں کھائیں گے۔ یہ ان دِنوں دہلی میں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات کا حال تھا۔ میں نے یہ واقعہ آصف علی کو سنایا، اس وقت آصف علی کے گھر پر مفتی کفایت اللہ بھی ملنے کو آئے ہوئے تھے جن کی متوازن طبیعت کے ذکر سے یہ بات چلی تھی۔ آصف علی بیرسٹر بڑے اچھے مقرّر تھے، وکالت بھی بڑی لگن اور محنت سے کرتے تھے، قانونی موشگافیوں اور دل نشیں انداز تقریر و تکلّم کی وجہ سے بڑی موثر شخصیت پائی تھی۔ کہنے لگے ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔ میں نے نہیں بلکہ ارونا (آصف علی کی ہندو بیوی) نے ایک مسلمان کے لیے شنکر لال کا گھر لینا چاہا۔ یہ شنکر لال آپ جانتے ہیں کون تھے۔ یہ مدن موہن کے بیٹے تھے۔ مدن موہن کے ایک لڑکے کا نام شنکر لال اور دوسرے کا نام سری رام تھا۔ یہ دِلّی کا صنعت

کارگھرانا تھا، دِلّی کلاتھ ملز کے مالک۔ مدن موہن پہلے تو مل کا معمولی کارندہ ہوا کرتا تھا اور ملکیت چھنّا مل کی تھی۔ چھنّا مل کا گھرانا غدر کے دِنوں میں یا یوں کہیے کہ غدر کی وجہ سے امیر ہوا تھا، اُن کے کئی کارخانے تھے۔ دِلّی کلاتھ ملز میں میرے والد کا بھی کچھ حصّہ ہوا کرتا تھا۔ وہ کبھی کبھی حساب فہمی کے لیے جاتے اور میں ان کے ہمراہ ہوتا۔ میری عمر دس بارہ برس کی ہو گی۔ ایک تخت پر اجلی چاندنی بچھی ہوتی اور اس پر چھوٹے سے ڈیسک کے سامنے مدن موہن بیٹھے ہوتے۔ میں بچّہ تھا میرے لیے تھوڑی سی مٹھائی منگا دیتے میں اس وجہ سے ان سے مانوس ہو گیا۔ یوں وہ بڑے لحاظ کے آدمی تھے۔ دِلّی میونسپل کمیٹی میں میرے ساتھ ممبر تھے۔ میں نیا نیا ممبر بنا تھا۔ مولوی عزیز اللہ بقائی نے کہا میرا کیس بلڈنگ کمیٹی میں آئے گا وہ پاس کرا دیں۔ میں نے حامی بھر لی۔ میونسپل کمیٹی میں رواج یہ تھا کہ انگریز افسر اجلاس کی صدارت کرتا، جب تعمیرات کے معاملات پیش ہوتے تو وہ اُٹھ جاتا اور وائس پریذیڈنٹ کی صدارت میں یہ معاملات طے ہوتے، میں نے مدن موہن سے عزیز اللہ کی بابت کہا۔ اس نے

وہیں ہریش کو آواز دی، یہ بلا کا وکیل تھا۔ اس سے ذکر کیا تو اس نے اپنی فائل دکھائی۔ ایجنڈے کی اس شِق پر اس نے ہاتھ سے دو صفحے اس کے خلاف لکھے ہوئے تھے۔ ہریش کہنے لگا کیس میں کوئی جان نہیں۔ مدن موہن بولے مولانا نے کبھی کوئی کام نہیں کہا اس لیے کرنا ہی ہو گا اور یوں عزیز اللہ بقائی کا وہ مشکل کام آسانی سے ہو گیا۔ مدن موہن کے اس طرح کے سلوک کی وجہ سے جو وہ مجھ سے روا رکھتے تھے میں نے سترہ برس کی عمر میں جب وہ کارخانے کی حصّے داری کے کچھ فارم عیوضی ووٹ کے بھر کر لائے تو بلا چوں و چرا اُن پر دستخط کر دیے تھے۔ دراصل ان کے بیٹے سری رام کو جو اَن پڑھ تھا اور بزاز کی دکان پر کام کرتا تھا کسی ہندو نے متبنّیٰ بنا لیا۔ جب وہ مرا تو ساری جائیداد سری رام کو ملی۔ بس اُن کے گھر والوں نے دِلّی کلاتھ ملز کے حصّے خریدنے شروع کر دیے۔ مدن موہن ڈائریکٹر ہو گئے۔ انہوں نے بہت ہوشیاری سے کام لیا۔ کبھی مِل کو آگ لگا دی، حصص کی قیمت گر گئی تو خرید لیے اور نقصان بیمہ کمپنی سے بھر لیا۔ غرض آزادی کے وقت نوّے فیصد حصص اِس گھرانے میں تھے۔ اُن کا شمار برلا اور ٹاٹا کے

ساتھ ہوتا تھا۔ مدن موہن کے دونوں بیٹوں یعنی شنکر لال اور سری رام کو سرکا
خطاب بھی ملا۔ اس گھرانے کی مسلم دوستی اور رواداری کا بڑا چرچا تھا۔ اُن کے
اُٹھنے بیٹھنے والوں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ آداب اور رواج میں مسلم
معاشرت کا بڑا لحاظ اور خیال رکھا جاتا تھا۔ دِلّی کلاتھ مِلز کے مشاعرے ایک
عرصے تک آزادی کے بعد بھی جاری رہے۔ اِس گھرانے سے مسلمانوں کے
خلاف کسی تعصب کی توقع نہ تھی۔ آصف علی کہنے لگے کہ ارونا نے ایک مسلمان
کے لیے شنکر لال کا ایک گھر کرایے پر لینا چاہا۔ جب یہ بات چھڑی تو اُس وقت
جیسا کہ میں بتا چکا ہو، مفتی کفایت اللہ بھی وہاں موجود تھے۔ ایک بار میں نے
طلاق کا ایک مسئلہ آصف علی اور مفتی صاحب کے سامنے رکھا۔ دونوں کی رائے
میں اختلاف تھا۔ آصف علی ٹھہرے وکیل، فوراً بڑی کتابیں اور حوالے نکال
لائے۔ ساڑھے تین گھنٹے تک گرما گرم بحث ہوتی رہی۔ گرم جوشی زیادہ آصف
علی نے دکھائی۔ مفتی صاحب نے بڑی دلچسپی اور تحمّل سے اِس بحث میں حصّہ
لیا۔ آخر طبیعت پر اختیار رکھتے تھے۔ اُن کے علم اور سمجھ کا یہ عالم تھا کہ آصف

علی کی ذہانت اور دلائل انہیں مرعوب نہ کر سکے۔ اس طویل بحث میں ایک بار بھی مفتی صاحب کی کسی دلیل یا سند کا درجہ آصف علی کے دیے ہوئے دلائل اور لائی ہوئی اسناد سے کم نہ تھا۔ متبحر عالم تھے۔ جب آصف علی نے گھر کا قصّہ پورا کرتے ہوئے بتایا کہ شنکر لال نے ارونا کے بیچ میں پڑنے کے باوجود مسلمان کو مکان کرائے پر دینے سے انکار کر دیا تو مفتی صاحب کہنے لگے، واحدی صاحب حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آنے والا زمانہ مسلمانوں کے لیے کتنا خراب اور تکلیف دہ ہو گا۔ مفتی صاحب نے جو یہ بدلتے اور بگڑتے حالات دیکھے تو جمعیت العلمائے ہند سے استعفٰی دے دیا۔ مسلم لیگ میں تو شامل نہ ہوئے لیکن سیاست سے کنارہ کش اور کانگرس سے دل برداشتہ ہو گئے۔ آزادی کے دو ایک برس بعد انتقال کیا۔ دینی حلقوں میں وہ بڑے نیک نام ہیں اور سیاسی حلقوں میں بھی اُن کا نام سب بڑی عزّت سے لیتے ہیں۔ سیاست میں حریف اور مخالف کے حصّے ایسی عزّت کہاں آتی ہے۔ یہ تو مفتی صاحب کے مزاج کا فیضان ہے اور مزاج جیسا کہ میں نے کہا بڑا متوازن تھا۔“

واحدی صاحب سے گفتگو کے دوران میری اور ابن حسن برنی کی کیفیّت یکساں تھی مگر نشست کا انداز مختلف تھا۔ میں باتوں میں محو اور کھویا ہوا تھا، اس لیے کرسی پر ڈھیر تھا۔ وہ توجّہ اور چوکس تھے اس لیے مؤدبانہ بیٹھے رہے انہیں اس طرح بیٹھے دیکھ کر مجھے واحدی صاحب کا شجرہ یاد آگیا۔ کہتے ہیں کہ نادر شاہ ہاتھی سے اس لیے اُتر گیا کہ اُس کی لگام نہیں ہوتی۔ نادر شاہ کو دِلّی میں قتلِ عام کرنے اور حلوہ کھانے کے بعد تھوڑی سی فرصت ملی، وہ سامان باندھنے میں صرف ہو گئی، وگرنہ وہ ہاتھیوں کو بھی لگام چڑھا دیتا۔ مُغلوں نے آدابِ شاہی کا حل ڈھونڈا کہ بخارا سے ایک صحیح النسب سیّد طلب کئے گئے جو سواری کے دوران فیل بان کی پُشت سے پُشت مِلا کر بادشاہ سلامت کے روبرو باادب باملاحظہ ہوشیار بیٹھے رہتے، یہ عہد و پیش نشیں کہلایا اور عہدیدار کو فوج دار خاں کا خطاب ملا۔ مُلّا واحدی آخری فوج دار خاں کی لڑکی کے پڑپوتے ہیں۔ ہاتھی چلتا تو بادشاہ کی نظر آگے پڑتی اور پیش نشیں کی نظریں پیچھے لگی رہتیں۔ واحدی صاحب کو ماضی کی طرف مُنہ کر کے دیکھنے اور لکھنے کی عادت شاید ورثے میں ملی ہے وہ دہلی مرحوم

کے پیش نشیں تو بن گئے مگر فوج دار خاں نہیں بن سکے۔ یہ خطاب تو اُن کے پیر و مرشد خواجہ حسن نظامی کو زیب دیتا ہے جنہیں قلق رہا کہ نصف صدی کی رفاقت کے باوجود مُلّا واحدی اُن کی انشا پردازی کے وارث نہ بن سکے۔

(۵)

واحدی صاحب کو جب میں نے آٹو گراف البم پیش کی تو انہوں نے ورق پلٹ کر چند دستخط دیکھے۔ ایک کو شناخت نہ کر سکے تو مُجھ سے پوچھا کِس کے دستخط ہیں۔ میں نے کہا اُس شخص کے دستخط شناخت کر سکتا ہوں مگر اُس کے ارادے اور نیّت کی پرکھ نہیں رکھتا۔ یہ دستخط ایک روباہ مزاج اور روسیاہ وزیرِ اعظم کے ہیں۔ واحدی صاحب نے اپنے دستخط کیے اور یہ نصیحت لکھی۔ "بولنے، لکھنے اور ہر کام کرنے میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اِس سے دین یا دنیا کا کوئی فائدہ ہو گا یا نہیں۔" دنیا سے واحدی صاحب کی مراد اپنی خواہشات کی تنگ و تاریک دنیا نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی فراخ اور کشادہ دنیا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ کیا میری البم میں کسی

ایسے شخص کے دستخط بھی موجود ہیں جس کی زندگی اس نصیحت کا عملی نمونہ ہو۔
میں نے ورق اُلٹے، شاہ اور بانوئے شاہ کو چھوڑ کر میں ایک شاعر کے دستخطوں پر
پہنچ کر رُک گیا۔ یہ شخص بھی عجیب ہے۔ چار بار جیل ہوئی، گیارہ حج کئے اور تیرہ
دیوان شاعری کے مرتب گئے۔ سیاسی ہنگاموں کا حساب اور عوامی تحریکوں کا شمار
ناممکن ہے۔ ملک کے لئے آزادی مانگی تو کالج سے نکالے اور حوالات میں داخل
کیے گئے۔ کتب خانہ اُردوئے مُعلّٰی ضبط ہوا۔ نایاب قلمی نسخے پولیس ٹھیلوں پر لاد
کر لے گئی۔ مسودات اُن کے سامنے جلائے گئے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائی
گئیں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔ ایک بار گرفتاری کا یہ منظر تھا کہ یہ جلسہ
گاہ میں زمین پر مُنہ کے بل گرے ہوئے تھے، پولیس کے کچھ سپاہی مار رہے اور
کچھ اُٹھا رہے تھے۔ کچھ بن نہ پڑا تو زمیں پر اُگی ہوئی گھاس کو پکڑ لیا اور جب انہیں
اٹھایا گیا تو گھاس بھی جڑ سے اُکھڑ آئی۔ ذرا سی دیر میں پولیس کی لاری پر یوں
لادے گئے جیسے بار برداری کا سامان لادا جاتا ہے۔ اُس وقت اُن کی زبان پر
انقلاب زندہ باد کا نعرہ تھا اور دونوں مٹھیوں میں گھاس۔ دیکھنے والوں نے جانا کہ

یہ شخص فرنگ کے دبدبے کو پر کاہ کے برابر بھی نہیں جانتا۔ جیل میں قیدِ تنہائی ملی۔ سال بھر ایک من آٹا ہر روز پیسا، ہتھیلیاں زخمی ہو گئیں مگر نازک خیالی اور مضمون آفرینی نہ گئی کہتے ہیں:

مایہ عشرت بے حد ہے غمِ قیدِ وفا

میں شناسا بھی نہیں رنج گرفتاری کا

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرتؔ

گرچہ سامانِ سحر کا تھا نہ افطاری کا

آج کل بیشتر سیاسی قیدی جیل میں اپنے گھر کی نسبت زیادہ آرام سے رہتے ہیں اور اگر کسی سیاسی تحریک کے سلسلے میں بہت سے لوگ قید ہوں تو جشن کا سماں بندھ جاتا ہے۔ باہر جتنا شور ہو لیڈر کو اندر اتنا ہی آرام ملتا ہے۔ حسرتؔ قید ہوئے تو اُن کے حصّے صرف اذیّت اور مشقّت آئی۔ علی گڑھ، جھانسی، الہ آباد، پر تاب گڑھ، فیض آباد، لکھنؤ اور میرٹھ کے جیل خانوں کی ہوا کھائی۔ علی گڑھ جیل سے الہ

آباد جیل بھیجے گئے تو سفر خرچ جو ایک آنہ یومیہ تھا وہ بھی نہ مل سکا۔ کُچھ دیر چنے پھانکتے رہے اور باقی وقت اور فاصلہ فاقے میں کٹ گیا۔ نظر بہت کمزور تھی لٰہذا اُن کی عینک جیل کے مال خانے میں جمع کرا دی گئی۔ پیسہ بہت کم تھا لٰہذا ایک پردہ دار بیوی کے ذمّہ یہ کام آن پڑا کہ وہ دُکان پر کھدر بیچنے کا انتظام کریں۔ والد کو بیٹے کا غم کھا گیا۔ وہ بیمار ہوئے تو جیل والے خاموش رہے، اُن کا انتقال ہوا تو بھی جیل والے خاموش رہے۔ کسی نے اطلاع تک نہ دی۔ جب ساری بلائیں تمام ہو گئیں تو حسرتؔ نے کہا

جو چاہے سزا دے لو، تم اور بھی کھل کھیلو

پر ہم سے قسم لے لو، ہو جو شکایت بھی

ہم عصر زعما کے جمگھٹے میں حسرتؔ سب سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں، وہ باہمہ رو، بے ہمہ شو کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ اس تصویر میں مصوّر نے ایسے رنگ بھرے ہیں جو آپس میں نہیں ملتے۔ ان کی تصویر بد رنگ تو نہیں البتّہ انوکھی

ضرور بن گئی ہے۔ جنگِ آزادی جاری ہے اور انگریز پر چاروں طرف سے یلغار ہے۔ ہر اول دستے میں ہر شخص کوئی نہ کوئی ذاتی امتیاز ضرور رکھتا ہے، اِس گروہ میں شامل ہونا بھی ایک امتیاز ہے اور اس میں ممتاز ہونا عظمت کی دلیل ہے۔ حسرتؔ اسی عظمت کے دعویدار ہیں۔ اس جنگِ آزادی کے دو محاذ ہیں، بحث مباحثہ اور میدانِ عمل۔ حسرتؔ ان چند سپاہیوں میں شامل ہیں جو دونوں محاذوں پر لڑ رہے ہیں، یوں لڑنے والوں کو زخم بھی دُگنے آتے ہیں۔ کُچھ اپنوں کے ہاتھوں اور کچھ غیروں کے ہاتھ۔ حسرتؔ کو اُن زخموں کی پروا نہیں۔ وہ ہٹ کے پکّے ہیں اور اُن پر ہر دم کوئی نہ کوئی دُھن سوار رہتی ہے۔ اُن کی طبیعت میں شدّت بہت ہے جو طرح طرح سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اگر رائے رکھیں گے تو انتہائی شدید، محنت کریں گے تو شاقہ، سزا جھیلیں گے تو کڑی، راہ اختیار کریں گے تو پُر خطر، حضر میں ہوں گے تو عسرت میں بسر کریں گے۔ ان کی یہ ادا اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی۔ لوگ شدّت اور استقامت کو ایک ضدّی طبیعت کی خصلت جان کر اُن کے خلاف ہو گئے۔ حسرتؔ نے جب معاشی انصاف کی بات

چھیڑی تو لوگ کہنے لگے یہ بات قبل از وقت ہے۔ پہلے انگریز کو رُخصت تو ہو لینے دو۔ جب حسرتؔ نے فوری اور مکمّل آزادی کا مطالبہ کیا تو لوگ کہنے لگے یہ بات بھی قبل از وقت ہے کیونکہ ہم تو دولت انگلشیہ کی نیم آزاد رکنیت کے حامی ہیں۔ اِدھر لوگوں میں دو رُخی تھی اور اُدھر حسرتؔ کی زندگی کے تین رُخ تھے۔ سیاست، سلوک اور شاعری۔ سیاست کا تقاضہ ہنگامہ پروری اور ہنگامہ پسندی تھا۔ سلوک کو سکون اور تنہائی کی ضرورت تھی۔ شاعری کو بے دماغی اور بے فکری درکار تھی۔ حسرتؔ نے یہ سارے تقاضے پورے کئے اور ایک مجموعۂ اضداد بن گئے۔ اُن کی ذات کی تقسیم یوں ہوئی کہ دماغ سیاست کو ملا، دِل شاعری کو بخشا گیا اور پیشانی عبادت کے لیے وقف ہو گئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حسرتؔ نے جسم کے ہر حصّے کو تین خانوں میں تقسیم کر رکھا ہو۔ کہنے کو دِل ایک تھا مگر محض سیاست، سلوک اور شاعری کی رعایت سے کبھی سنگ و خشت کبھی گداز و نرم اور کبھی شوخ و گُستاخ۔ حسرتؔ کا یہ کمال ہے کہ بیک وقت تین راہوں پر مختلف سمتوں میں چلتے رہے، نہ کوئی راہ گُم کی اور نہ کسی منزل سے

محروم رہے۔ ان کے یہاں سیاست سلوک اور شاعری خلط ملط نہیں ہوتے۔ وہ باغیانہ تقریریں کرتے ہیں مگر باغیانہ اشعار کہنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ شعر میں کھُل کر معاملہ کے مضمون باندھے اور زندگی میں سختی سے آداب و اخلاق کی پابندی روا رکھی۔ ان میں شاعر جتنا نرم خُو چھپا ہوا تھا، لیڈر اتنا ہی تُند خُو تھا۔ ان کے شعر حریر و پرنیاں تھے، ذات خُشک و درشت اور صفّات محراب و منبر۔

مذہب کے معاملے میں حسرتؔ کا شغف ایک شدّت اختیار کر چکا تھا، شریعت کی پابندی اُن کے لیے ایک معمولی بات تھی لہٰذا وہ طریقت کی کٹھن راہ پر جا نکلے۔ سفر ہو کہ حضر، گھر ہو کہ جیل وہ ریاضات اور مجاہدات میں مصروف رہے۔ مکاشفات کی مختلف منازل سے گزرنے اور رشد و ہدایت کے مختلف مدارج طے کرنے کے بعد خلافت تک جا پہنچے۔ آخری منزل انہیں جیل جا کر ملی جہاں سے مولانا عبد الباری فرنگی محلی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اس وقت تک میں نے شرم کے سبب سے اپنا حال آپ کو نہیں لکھا تھا مگر آج با ایمائے خاص بذریعہ عریضہ ہذا درخواست کرتا ہوں کہ بر وقت ضرورت مجھ کو

سلسلہ چشتیہ صابریہ رزاقیہ انواریہ والیہ رزاقیہ میں بیعت لینے کی اجازت مرحمت ہو۔" حسرتؔ نے یہ اجازت بذریعہ تار منگوائی تھی۔ بیعت کرنے میں وہ ہر سالک سے آگے تھے اور جب اجازت ملی تو بیعت لینے میں کسی شیخ سے پیچھے نہ رہے۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ مزارات پر حاضری دینی شروع کر دی اور پابندی سے اعراس میں شامل ہونے لگے۔ اپنے پر دادا شاہ وجیہہ کے عُرس کے لیے ایک وقف بھی قائم کیا۔ اس شوق کے ساتھ سماع کا ذوق بھی شامل ہو گیا اور وہ قوّالی کے رسیا ہو گئے۔ حسرت کا اوّلیں نقش جو میرے ذہن میں محفوظ ہے وہ بھی ایک قوّالی کی رعایت سے ہے اگرچہ اُس کی نوعیت عام قوّالیوں سے بہت مختلف ہے۔

میرے بچپن میں موسیقی کا رواج اتنا عام نہ تھا کہ وہ زمین کا بوجھ اور ہوا کی کثافت بن کر رہ جائے۔ اُن دِنوں اس کا پودا گملے میں لگا کر بالا خانے پر سجایا ہوا تھا۔ گراموفون کا تعلّق موسیقی سے زیادہ عیاشی اور آزار سے تھا کیونکہ وہ خریدنے میں عیاشی اور سُننے میں آزار سے کم نہ تھا۔ ریڈیو بہت کم تھے کیونکہ برِّ عظیم کی پہلی نشر گاہ کو قائم ہوئے صرف چند ماہ گزرے تھے۔ مُجھے اچھی طرح یاد

ہے کہ وہ گرمیوں کا موسم اور رات کا وقت تھا، ہمارا ریڈیو صحن میں رکھا تھا۔ اینٹوں کے پکّے فرش پر چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔ چارپائیوں پر بستر لگے تھے اور گھر کے لوگ اُن پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بتّی بند تھی مگر ہلکی سی روشنی ریڈیو کے بلب سے چھِن رہی تھی اور کُچھ اندھیرا ابھی دُھلا دُھلا تھا۔ ایسے میں دِلّی ریڈیو سے اعلان ہوا کہ شمشاد بیگم اور امراؤ ضیا بیگم مل کر ایک غزل گائیں گی۔ غزل شروع ہوئی۔ مطلع تھا

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جایئے

بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

شمشاد اور امراء دونوں کا شہرہ تھا، یہ علیحدہ علیحدہ گاتی تھیں، جب پہلی بار مِل کر گایا تو لطف دوبالا ہو گیا۔ شمشاد کی آواز باریک تھی اور امراؤ کی آواز میں کھرج تھا۔ دونوں لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ آواز میں جادو تھا اور غزل میں برجستگی، ایک سماں بندھ گیا۔ یہ طویل اور مسلسل غزل نفسِ مضمون کے اعتبار سے

واسوخت ہے مگر لہجے کی رومانی شائستگی خالص روایتی غزل کی ہے۔ غزل کے آخری شعر آئے تو قطع تعلّق کی ضرورت کا ذکر کرنے اور ترکِ محبّت پر اختیار رکھنے کا دعویٰ کرنے والے شاعر نے روایت اور محبوب دونوں کے پاؤں پکڑ لیے۔

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر

اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جایئے یہ بے بسی اور یہ بے اختیاری کہ نہ وہ مائل ہو اور نہ اُس سے خفا ہو سکیں۔ شاعر اِس کشمکش میں گرفتار ہوا اور کہنے لگا۔

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرتؔ جی میں ہے

چھٹ کے اُن جھگڑوں سے مہماں قضا ہو جایئے

مقطع گایا گیا تو عقدہ کھلا کہ غالبؔ کی طرح بلاؤں کے تمام ہونے پر مرگِ ناگہانی کی آرزو کرنے والا شاعر حسرتؔ تخلص کرتا ہے۔ غزل تمام ہوئی تو حسرتؔ کے چاہنے والوں میں ایک کا اضافہ ہو گیا۔ جِن سے اَن دیکھے چاہت ہو جاتی ہے انہیں دیکھنے کی خواہش بہت شدید ہوتی ہے۔ جب میں نے حسرتؔ کو پہلی بار

شاعر کی حیثیت سے دیکھا تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ وضع قطع بے ڈھب، جسم بے ڈول، لباس بے طور، آواز ناخوش۔ اُن کی ذات میں اتنا کھُردرا پن نظر آیا کہ پاس جاتے ہی چھِل جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ شاعرانہ بانکپن کا اُن کی صورت شکل اور رہن سہن سے کوئی واسطہ نہ تھا، بلکہ تعجّب ہوتا کہ نازک خیالی اور شوخی نے اپنے ٹھکانے کے لیے کیسا اُجاڑ مکان منتخب کیا ہے۔ اُن دِنوں شعر کی بڑی قدر تھی اور مشاعروں کا اہتمام بہت تکلّف کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ بڑے شاعر اُن مشاعروں میں بہت سے احباب اور بڑے بڑے القاب کے ہمراہ ٹھُسّے سے آیا کرتے تھے۔ شاعرِ انقلاب، شاعرِ شباب، شاعرِ رومان، امامِ یاسیات، فردوسی اسلام، شاعرِ مزدور، یگانۂ روزگار، شانِ نشریات، جانشینِ داغ اور غزل کی آبرو۔ جب کسی اجتماع میں شامل ہوتے تو اپنے اپنے سبھاؤ کا پورا پورا خیال رکھتے۔ ساغر نظامی ایک ایسے کامیاب شاعر تھے جن کے یہاں سبھاؤ کے ساتھ سنگھار بھی ہوتا تھا۔ اس منظر میں یہ دیکھ کر یقین نہ آیا کہ وہ جو کھدر کی اچکن میں دُہرے بدن والا بال بڑھائے پکّی ٹوپی پہنے، ٹوٹی کمانی کی عینک لگائے بیٹھی ہوئی

آواز سے باتیں کر رہا ہے، وہی رئیس المتغزلین حسرت موہانی ہے۔ پہلی نظر میں صرف اتنا دیکھا کہ اس شخص پر حسرت برستی ہے اور اس شاعر کا قافیہ عُسرت سے ملتا ہے۔ اِس تجربے کے بعد میں نے پہلی نظر سے کبھی دھوکہ نہیں کھایا کیونکہ اس کا اعتبار بالکل اُٹھ چکا ہے۔ اب تو کئی کئی بار دیکھنے کے بعد بھی سوچنا پڑتا ہے کہ جو دیکھا وہ کہیں نظر بندی کا عالم تو نہ تھا۔

حسرتؔ کی سادگی میں اُن کے مشرب اور مشغلے دونوں کا حصّہ تھا۔ ان کے قومی کام اتنے اور ایسے تھے کہ جم کر روزی کمانے کی نوبت ہی نہ آئی اور اگر کہیں سے کچھ دریافت ہوئی تو اُس کو گنوانے کے سو بہانے بن جاتے تھے۔ سرکاری ملازمت کے خلاف اُن کا خمیر اُٹھایا گیا تھا۔ کوئی نجی ادارہ اُنہیں ملازم رکھ کر انگریز سرکار کا عتاب کیسے مول لیتا، کسی دوسرے کی مالی امداد پر جینے کے وہ روادار نہ تھے۔ عُسرت بھی اُن کے کاموں میں حائل نہ ہوئی اور انہی کاموں کی وجہ سے انہیں اپنا کام کرنے کا بھی وقت نہ ملا۔ کھدر کی دُکان ہو کہ رسالہ اور چھاپے کی مشین بھی توجّہ سے محروم رہے یا ضبط ہوئے۔ عُسرت کا علاج انہوں

نے دنیاوی ضروریات کو امکانی حد تک کم کر دینے سے کیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار کسی دوست کو لکھا کہ اسمبلی سے ملنے والا سفر خرچ بچا رہا ہوں تا کہ مجلس اقوامِ متحدہ میں جا کر اُردُو کا مسئلہ اُٹھا سکوں۔ حسرتؔ کی سادگی اُن کی آخری منزل نہ تھی، اُن کا سفر قناعت سے شروع ہوا اور لا تعلّقی پر پہنچ کر ختم ہوا۔ اُن کے انتقال پر مولانا ابو الکلام آزاد نے لکھا کہ انہیں دیکھ کر قرونِ اولیٰ کے مسلمان یاد آتے تھے۔ اسلاف کی اِس یادگار کو لوگوں نے کھدر کے کپڑے کی دُکان کرتے بھی دیکھا ہے۔ اُس دُکان پر ایک پیمانہ تھا اور ایک معیار، وہ کپڑے کے لیے اور یہ آدمیت کے لیے۔

کوئی عام آدمی ہوتا تو حسرتؔ کی زندگی میں پیش آنے والی سختیاں سہتے سہتے ساری سخن فہمی اور سخن سنجی ہوا ہو جاتی۔ حسرتؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے شاعری اِس دِلجمعی سے کی گویا وہ اسی کے لیے پیدا ہوئے تھے اور اِس کے علاوہ انہیں کسی اور بات سے دلچسپی نہ تھی۔ حسرتؔ نے اپنی شاعری کو سیاست سے آلودہ نہ ہونے دیا اور اسی طرح راہِ سلوک میں بھی قافیہ پیمائی سے اجتناب کیا۔ سیاست

اور طریقت کا حوالہ ان کی شاعری میں صرف اس قدر ملتا ہے کہ ان کے شوق کی نشاندہی ہو سکے۔ ان دونوں مضامین کے اشعار علیحدہ کر لیں تو وہ خالص غزل کے شاعر رہ جاتے ہیں۔ غزل کی خوش قسمتی ہے کہ حسرتؔ نے شعر کو سیاست میں نہیں گھسیٹا، وگرنہ مومنؔ، نسیمؔ اور تسلیمؔ کے جانشین کا دیوان ایسے سیاسی اور ثقیل مصرعوں سے بھرا ہوتا۔

بلونت تلک، مہراج تلک، آزادی کے سر تاج تلک

گنگا دھر بال تلک کی سیاسی خدمات اتنی عظیم کب تھیں کہ اُن کی خاطر اُردُو شاعری کو حسرتؔ کے ہاتھوں تلخ اور بدمزہ کیا جاتا ہو تو شاعری کے دو مکاتیب کی خوبیوں کو باہم جمع کرنے اور یوں غزل کا ذائقہ بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے آئے تھے، میں نے اس ذائقے کا لُطف پہلی بار گرمیوں کی ایک آسودہ شام کو اُٹھایا تھا مگر اب شعر حسرتؔ سے لطف اندوز ہونے کے لیے موسم اور وقت کی کوئی قید نہیں رہی۔

اُردُو میں شعر کہنا بہت سہل اور اچھا شعر کہنا بڑا کٹھن کام ہے، اِسی لیے اُردُو کو ہر زمانے میں شعر گُو بیشمار میسّر آئے ہیں اور شاعر گنتی کے۔ اُردُو شاعری ایک ایسا کچّا راستہ ہے جس پر ہر وقت غول کے غول چلتے ہیں اور روایت کی دھول اتنی اُڑتی ہے کہ سارے مسافروں کے چہرے خاک سے اٹے رہتے ہیں۔ مضامین متعین، قافیے وافر، بحور تابع، اوزان موزوں، زمیں پائمال، اساتذہ بسیار، شاگرد قطار اندر قطار۔ اساتذہ ہر مُشکل بحر کو پانی کر چکے ہیں، شاگرد ہر سنگلاخ زمین میں قافیے بو چکے ہیں۔ شاعری کے کتنے ہی دبستان کھُل چکے ہیں لہٰذا ہر نوع کے شاعر کو ہاتھوں ہاتھ لینے والے بھی موجود ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے جو ایک سطر نثر بھی نہیں لکھ سکتا وہ بھی اِس کچّے راستے پر ہو لیتا ہے۔ حسرتؔ نے جو یہ منظر دیکھا تو شعر گوئی کا تجزیہ کیا اور اِسے مختلف حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ چونکہ شاعر تھے اِس لیے اقسامِ شعر کے نام رکھتے ہوئے قافیہ بندی کا خیال رکھا۔۔۔ عارفانہ، عاشقانہ، فاسقانہ، ماہرانہ، نافعانہ، ضاحکانہ، شاعرانہ، واصفانہ اور باغیانہ۔ اس اصول کے مطابق حسرتؔ کی شاعری آمد کے تحت عاشقانہ مد میں آتی ہے۔ یہ

عنوان اِس کلام کے لیے مخصوص ہے جو "خالص جذبات حسن و عشق کا حامل اور خوبی کے لیے کسی محسوس صنعت گری کا محتاج نہ ہو۔" حسرتؔ نے شعر گوئی میں اِس اصول کی پیروی اور پابندی کی ہے۔

حسرتؔ کے سامنے شاعری کے دو مستند مدرسے تھے، دہلی اور لکھنؤ۔ ایک بیان کی وجہ سے ممتاز تھا اور دوسرا زبان کی خاطر۔ حسرتؔ نے اپنی اس عادت کے خلاف، جس کا اظہار وہ سیاست یا سلوک میں کیا کرتے تھے، شاعری میں میانہ روی اختیار کر لی۔ کچھ خوبیاں دہلی سے جمع کیں اور کچھ لکھنؤ سے اور انہیں ملا کر اپنی شاعری کا قوام تیّار کیا۔ سب سے پہلا مسئلہ زبان کا تھا۔ دہلی میں جو مفرّس اور معرّب الفاظ تراکیب اور محاورے استعمال میں آتے، اہلِ لکھنؤ اُن پر غرابت کی تہمت لگاتے۔ اِدھر لکھنؤ میں جو روزمرّہ اور عامی زبان ادب کے لئے جائز سمجھی گئی اُسے اہلِ دہلی نے ضلع جگت اور بد مذاقی کا درجہ دیا۔ حسرتؔ نے عربی اور فارسی پر قدرت رکھتے ہوئے انہیں اپنی شاعری کے دائرے سے باہر رکھا حالانکہ ہر وہ اُردُو شاعر یا نثر نگار جو اِن زبانوں پر قادر ہوتا ہے وہ اُن سے مغلوب

ہو جاتا ہے۔ جس طرح حسرتؔ نے ان نامانوس الفاظ سے اپنی غزل کو بچا کر رکھا اِسی طرح اِن مانوس الفاظ سے بھی اُسے پاک رکھا جن کے استعمال کا حق شعرائے لکھنؤ کے لیے محفوظ تھا۔ حسرتؔ نے غزل میں سلیس اُردُو کا استعمال کیا کیونکہ اِس سلسلے میں ذرا سا اہتمام بھی اُن کی شاعری پر آورد کی تہمت لگا دیتا اور اسے عاشقانہ کے بُلند درجہ سے نکال کر شاعرانہ یا ماہرانہ کلام کے پست درجہ پر پہنچا دیتا۔ سادہ زبان منتخب کرنے کے بعد حسرتؔ نے بیان کا مرحلہ بھی سادگی سے طے کر لیا۔ اُن کے بیان کی دو خوبیاں ہیں، کھری برجستگی اور معصوم شوخی۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اُسے صاف صاف بیان کرتے ہیں۔ اُن کے محسوسات حسن و عشق کی مجازی دنیا سے متعلق ہیں اور اُن کا ادراک دروں بینی سے ہوتا ہے۔ انہیں دِل میں جھانکنے پر جو کچھ نظر آتا ہے اُسے برملا شعر میں بیان کر دیتے ہیں اور اپنے احساس کے پس منظر میں کسی فلسفے یا آفاقیت کی تلاش نہیں کرتے۔ اُن کا شعر قیاسی نہیں واقعاتی ہے، اُن کا بیان مجسّم نہیں مترشح ہے، وہ بجھاوت نہیں ممتنع کہتے ہیں۔

شعر کہتا ہوں ممتنع حسرتؔ

نغز گوئی میرا شعار نہیں

حسرتؔ کا شعار یہ تھا کہ شعر برجستہ، بحر سادہ، موضوع روایتی، خیال اکثر شوخ بیان گاہے رنگین۔ اِن تمام خوبیوں کا عکس اِس غزل میں ملتا ہے۔

لایا ہے دل پر کتنی خرابی — اے یار تیرا حسن شرابی!

پیرہن اس کا ہے سادہ رنگیں — یا عکس مے سے شیشہ گلابی

عشرت کی شب کا وہ دور آخر — نورِ سحر کی وہ لاجوابی

پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں — کیفیت ان کی وہ نیم خوابی

بزمِ طرب ہے وہ بزم کیوں ہو — ہم غم زدوں کو واں باریابی

اس ناز نیں نے باوصف عصمت   کی فصل کی شب وہ بے حجابی

شوق اپنی بھولا گستاخ دستی   دل ساری شوخی حاضر جوابی

دو روئے زیبا ہے جان خوبی   ہیں وصف جس کے سارے کتابی

اس قیدِ غم پر قربان حسرتؔ

عالی جنابی، گردوں رکابی

حسرتؔ کی داستانِ حسن و عشق ایک گھریلو داستان ہے اور اُن کی شوخی میں سچائی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایسی شوخ داستان کا بیان بڑا مُشکل ہوتا ہے۔ شوخی کے تقاضے پورے کریں تو خوش مذاقی کا خون ہو جاتا ہے اور احتیاط کا دامن مضبوطی سے تھامے رہیں تو ارمانوں کا خون ہو جاتا ہے۔ حسرتؔ کے یہاں شوق اور جرأت کی بے باکی ملتی ہے مگر اظہار پر خرد سے زیادہ معصومیت کا پہرہ ہے۔ اِن

چند اشعار کو چھوڑ کر جن میں رضائی کے حائل ہونے، منہ سے پان چھین لینے اور بندِ قبا کے واہو جانے کا ذکر ہے، حسرتؔ کی رنگین بیانی اہمال سے بالکل پاک ہے۔ اُن کی شوخی ایسے نوخیز جذبات کی ترجمانی سے پیدا ہوئی تھی جن کا خاموش تجربہ نوجوانوں کو ہوتا ہے۔ شہر کے گنجان آباد محلّوں میں متوسط طبقے کے پردہ دار گھرانوں کی بے پردگی کے قصّے، غرفے سے آنکھیں لڑانا، دانتوں میں انگلی دبانا، دوپٹے سے منہ چھپانا، کوٹھے پر ننگے پاؤں آنا، مہندی لگا کر بے دست و پا ہونا، موقع شناس عاشق کا چھیڑنا اور گدگدانا، پہلے منانا اور پھر منا کر روٹھ جانا۔ ایسے تجربات ہیں جنھیں ان دِنوں جانتے تو سب تھے مگر زبان صرف حسرتؔ نے ہی دی۔ یہ محسوسات حسرتؔ کے الفاظ میں ”عیش با فراغت“ اور ”ناواقفیت کے مزے ہیں“ اور ”عہدِ ہوس کا فسانہ“ انہی سے عبارت ہے۔ وہ آغازِ الفت کو یاد کرتے ہوئے اپنے شوق سے سوال کرتے ہیں۔

اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی

جس پر اُنہیں غصّہ ہے انکار بھی حیرت تھی

ایک اور شعر میں کہتے ہیں۔

چھیڑتی ہے مجھے بے باکی خواہش کیا کیا

جب کبھی ہاتھ وہ پابندِ حنا ہوتے ہیں

دیوانِ حسرتؔ میں اگر محبوب کے ہاتھ پابندِ حنا ملتے ہیں تو شاعر کا بیان پابندِ حیا ملتا ہے۔ یہ باحیا شاعر کھرا عاشق ہے اُس کے بیان میں نہ صنعت گری کا تکلّف ہے نہ شعبدہ بازی کا تصنّع، بات دِل سے نکلتی ہے اس لیے دِل میں اُتر جاتی اور زبان پر چڑھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ تین شعر پیش کیے جاسکتے ہیں جو ضرب المثل بن چکے ہیں۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

رہنا تھا اُن کا ہو کے رہے جو عزیزِ خلق

ہم کیا رہے کہ طبعِ جہاں پر گراں رہے

صحتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پہ نثار

جس میں اُٹھے بارہا اُن کی عیادت کے مزے

غزل میں روایت کی پابندی جتنی آسان ہے یہ بات اِس قدر دشوار ہے کہ غزل گُو کا اسلوب مانوس بھی معلوم ہو اور نیا بھی لگے۔ لوگ شعر کا رشتہ تہذیبی ورثے میں بھی تلاش کر سکیں اور یہ بھی کہہ اُٹھیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور۔ حسرتؔ اس دشوار راہ پر چلنے والے شاعر ہیں۔ ان کا مضمون پیش پا افتادہ مگر اُن کا بیاں تازہ تر تھا۔ اُردو میں کتنے ہی شعرا نے رُعبِ حُسن کی اِس کیفیّت کا ذکر کیا ہے جس میں محبوب کے سامنے آنے پر عاشق کی زبان گنگ ہو جاتی ہے اور کہنے سُننے کے سارے ارمان دل ہی میں رہ جاتے ہیں۔ اس خیال کو حسرتؔ نے

یوں ادا کیا ہے۔

اب ان سے کہو آرزوئے شوق نہ حسرتؔ

وہ حسنِ بیاں آج کہاں گُم ہے تمہارا

غمِ انتظار بھی ایک ایسا موضوع ہے جس پر لاتعداد شعر کہے گئے ہیں اور بیشتر غم کی شدّت اور انتظار کے لاحاصل ہونے کے بارے میں ہیں۔ حسرتؔ کا فلسفۂ غم اِس روایت سے مختلف ہے۔ غم انہیں ویرانی اور وحشت کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ اُن کے نہالِ فکر کو سرسبز اور کشتِ خیال کو سیراب کرتا ہے۔

کس قدر سبز و تر ہے کشتِ خیال

گریۂ انتظار ہے شاداب

ایک اور شعر میں محبوب کی راہ تکتے تکتے اُن کی آنکھیں پتھراتی نہیں، بلکہ سرمایہ دار انتظار بن جاتی ہیں۔ چونکہ حسرتؔ غم کا تعلّق بیتی ہوئی خوشیوں سے قائم کر

لیتے ہیں اِس لئے اُن کے یہاں غم کو برداشت کرنے کی ہمّت اور اُس سے سمجھوتہ کرنے کا سلیقہ ملتا ہے۔ اُس کی بہترین مثال اِن اشعار میں ملتی ہے جو ۱۹۳۰ء میں بیگم حسرت کے انتقال پر کہے تھے۔

غیر ممکن ہے تیرے بعد ہوس

دِل کسی اور سے لگانے کی

مٹ گئیں آپ بھی مٹا کے تجھے

سختیاں خود بخود زمانے کی

اب نہ وہ دِل نہ وہ ذخیرۂ شوق

توڑ دوں کنجیاں خزانے کی

ان کے بعد اب وہ کیا ہوئی حسرتؔ

دلفریبی ترے فسانے کی

میں نے یونین ہال میں حسرتؔ کی تقریر سُنی۔ اُس میں فسانے کی کوئی دلفریبی نہ تھی۔ ہم دھواں دھار تقریریں سُننے کے عادی ہو چکے تھے اور یہ تقریر صرف دھواں دھواں تھی۔ وہ اپنی پھٹی پھٹی آواز میں صاف گوئی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انگریز سے باغی، ہندو سے ناراض، مسلمانوں کی نامسلمانی سے بیزار، مسلم لیگ کے نوّاب زادوں اور جاگیر داروں سے مایوس۔ وہ معاشی نظام کی ناانصافی پر برس پڑے۔ سرمایہ داری پر بھی عتاب آیا اور بات انقلاب تک جا پہنچی۔ وہ اچھے مقرّر نہ تھے۔ اُن کی تقریر سے مایوسی اور غلط فہمی ہوئی، کچھ اُن کی ذات کے بارے میں اور کُچھ اُن کے خیالات کے بارے میں۔ کسی نے کہا سٹھیا گئے ہیں۔ کسی نے کہا یہ محض مخالفت کرنا جانتے ہیں۔ کوئی بولا نہیں صرف شاعری کرنی چاہیے سیاست اِن کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ باتیں وہ نوجوان طالبِ علم کر

رہے تھے جن کی پیدائش سے کئی برس پہلے حسرتؔ نے آزادی کی خاطر قیدِ با مشقّت کی سزا کاٹی تھی۔ ایک سخت جاں نسل کی قربانیوں کے طفیل انگریز اب آزادی کے مطالبے پر گفتگو کے لیے تیّار ہو گیا تھا۔ نئ نسل نے گول میز اور شملہ کانفرنس کو انگریز کی رواداری جانا اور اُسے وہ پرانی نسل بے کار معلوم ہونے لگی جس پر سارے ظلم و ستم آزمانے کے بعد انگریز اِس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ

روح آزاد ہے، خیال آزاد

جسمِ حسرتؔ کی قید ہے بے کار

قید کی زنجیریں ٹوٹنے کو ہیں اور اِس کے ساتھ نئ اور پرانی نسل کے رشتے بھی ٹوٹ جائیں گے۔ حسرتؔ نے جن کے لئے دکھ اُٹھائے اُنہیں کے لیے اجنبی بن جائیں گے۔

ایک دِن میں کسی سلسلے میں علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ دوسرے درجے کے مسافر خانے میں مولانا حسرتؔ موہانی بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹین کا چھوٹا سا

بکس، میلی دری میں لپٹا ہوا تکیہ۔ یہ دونوں چیزیں رسّی سے بندھی ہوئی تھیں جس کی ایک گرہ سے لوٹا بندھا ہوا تھا۔ میرا جی بہت چاہا کہ یہ سامان اُٹھا کر ڈبّے تک پہنچا دوں مگر میں سوچتا ہی رہ گیا اور انہی ہاتھوں نے جو جیل میں چکّی پیستے تھے یہ سامان اُٹھالیا۔ بھرے بھرے بھدّے ہاتھ جن میں کل رات ایک باریک نِب والا قلم پکڑ کر اِس باغی صفت صوفی منش، غریبِ شہر اور رئیسِ غزل نے میری آٹو گراف البم میں لکھا تھا:

فقیر حسرت موہانی ۲ دسمبر ۱۹۴۳ء

فقیر کے نقطے نہیں اور موہانی تو صرف شوشے دار نصف دائرہ اور ایک ٹیڑھی لکیر ہے۔ نقطے نہ سہی، وہ شخص نکتہ سنج تو تھا۔ لکیر سیدھی نہ سہی، وہ خود تو ساری عمر صراطِ مستقیم پر چلتا رہا۔ دستخط بدخط سہی، وہ شاعر تو خوش نوا تھا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ فقیر لکھا ہے اور یہ بات برحق ہے۔ اِس کی روشن ضمیر ذات میں فکر و فقر اور روایت و بغاوت یوں جمع ہو گئے کہ بے اختیار اُس کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے

اِک طُرفہ تماشہ تھی حسرتؔ کی طبیعت بھی

(۶)

جیل میں چکّی کی مصیبت کے ساتھ ہی ساتھ مشقِ سخن جاری رکھنے کے لیے جو طرفہ طبیعت درکار ہے وہ حسرتؔ کے ایک ہم مشرب اور ہم عصر کے حصّے بھی آئی۔ اِن دونوں کی مُشکلیں اور مشغلے یکساں تھے۔ انگریز سے نفرت اور اِس کی پاداش میں نظر بندی، آزادی کا مطالبہ اور اِس کے جواب میں جیل دین کی خدمت لٰہذا جائیداد قرق اور جب اِس احوال کو نظم کیا، تو شعر بھی ضبط ہو گیا۔ شوقِ گناہ ہر سزا کے بعد بڑھتا چلا گیا اور ایک نے شاید گیارہ اور دوسرے نے چودہ سال قید اور نظر بندی میں گذار دیے۔ اِن کی ایذا پسندی اور نازک خیالی کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر مار کھاتے اور شعر کہتے گزر گئی۔ بالآخر سیاست کی راہ میں زندگی لُٹا دینے کے بعد اُن دونوں کا وہ سفر جو شور انگیزی سے شروع ہوا تھا بڑھاپے اور قدر ناشناسی کی منزل پر ختم ہو گیا۔

حسرتؔ کی طرح اِن کے ہم عصر نے بھی جیل میں اور جیل پر بہت سے شعر کہے ہیں۔ ان کے ایک مصرعے میں کولہو کی مشقّت اور چکّی کے عذاب کا ذکر ہے مگر اِس مشقّت کو برداشت کرنے اور اِس عذاب میں مبتلا ہونے کا وقت آیا تو یہ شعر موزوں ہوا ؎

زمانہ قید کا برطانیہ کے زندانی

مصیبتوں میں خوشی سے گزار دیتے ہیں

پریس اخبار اور جائیداد قرق ہوئی تو طبیعت یوں موزوں ہوتی ہے ؎

مری روزی نہ کی قرق اُس نے میری سرکشی پر بھی

خداوندانِ لندن سے مِرا پروردگار اچھا!

جب چکّی پیستے اور گردشِ دوراں کی چکّی میں پستے ہوئے ایک عمر گزر گئی تو شاعر کو خُدا یاد آجاتا ہے، شکوہ و شکایت کے لیے نہیں بلکہ تشکّر و تسلیم کے لیے۔

یہ ہے پہچان خاصانِ خُدا کی ہر زمانے میں

کہ خوش ہو کر خُدا اُن کو گرفتارِ بلا کر دے

حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں دونوں عمر بھر گرفتارِ بلا رہے۔ اِس کے علاوہ اور بھی بہت سے امتیازات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن دونوں کا درجہ خاص اور مرتبہ بُلند تھا۔ اِن تمام باتوں کے باوجود حسرتؔ اور ظفر علی کی شخصیت ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد تھی۔ موازنے کے لیے مولانا ظفر علی خاں کا جوڑ مولانا محمد علی سے ٹھیک بیٹھتا ہے۔ دونوں ایک ہی مادرِ درسگاہ کے مشہور اور لائق فرزند تھے۔ عملی زندگی میں دونوں کو صحافت، خطابت اور بغاوت کی وجہ سے ناموری حاصل ہوئی۔ انگریز نے اُن کو نوکری نہ دی اور دیسی ریاستوں کی نوکری وہ نبھا نہ سکے۔ ترکوں کے لیے زور شور سے تحریک چلائی اور ناکام رہے۔ ادب، شعر اور نعت گوئی میں حصّہ لیا تو دونوں کامیاب ٹھہرے، مولانا کہلائے اور مولویوں کا ہدف بنے۔ طبیعت دونوں کی سیمابی تھی اور ہنگامہ پروری میں لگی رہتی تھی۔ زندگی شہرت میں بسر ہوئی مگر موت نے اُن کی راہیں جُدا کر دیں،

ایک کو بیت المقدس میں جگہ ملی تو اقبال نے کہا۔

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبرِ گذشت

دوسرے کے بارے میں پوچھنا پڑتا ہے کہ کب اور کہاں پیوندِ خاک ہوئے۔ جاننے والے کہتے ہیں کہ دونوں کی صلاحیتیں بے بدل تھیں اور خدمات بے حساب مگر ایک کو زندگی نے معترض زیادہ دیے اور دوسرے کو معترف۔ اس میں کچھ زمین کی زرخیزی کا فرق تھا اور کچھ بیج کا اپنا نقص۔

اُردُو کے ایک معلّم کا خیال ہے کہ ظفر علی خاں اگر سیاست میں اُلجھ کر نہ رہ جاتے تو وہ اقبال بن سکتے تھے۔ اِس رائے کی بنا پر وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر اقبال سیاست میں زیادہ وقت صرف کرتے تو کیا وہ ظفر علی خاں بن جاتے۔ اِس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہر شخص وہی ہوتا ہے جو وہ بنتا ہے اور ہر انسان صرف وہی بن سکتا ہے جو وہ ہوتا ہے۔ انسان سب یکساں بھی ہیں اور منفرد بھی۔ کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا کیونکہ اس دنیا میں جتنے انسان ہیں جگہیں بھی اُسی قدر

ہیں۔ کسی فرد کے بارے میں یہ رائے تو دی جاسکتی ہے کہ اگر وہ اپنی صلاحیت کو ضائع نہ کرتا تو بہتر آدمی بن سکتا تھا مگر ایک بڑے آدمی کے بارے میں یہ کہنا مضحکہ خیز لگتا ہے کہ اگر وہ اپنی صلاحیت کا دوسری طرح استعمال کرتا تو وہ دوسرا بڑا آدمی بن سکتا تھا۔ اقبال اور ظفر علی خاں میں سطح کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ اُن کے اُلٹ پھیر اور ادل بدل کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ ظفر علی خاں کا شمار ملّت کے دست و بازو میں ہوتا ہے اور اقبال شعورِ ملّت کا دوسرا نام ہے۔ یہ بات درست ہے کہ دونوں شاعر تھے مگر ایک نے شاعری کو پہلوانی کے لئے استعمال کیا اور دوسرے نے پیغمبری کے لئے۔

ظفر علی خاں کے کلام کے دو حصّے ہیں، سیاسی نظمیں اور نعتِ رسولؐ۔ ظفر علی کی سیاسی شاعری تیز و تند کہستانی ندی کی طرح دشوار راہوں سے گزرتی، چٹانوں سے ٹکراتی اور شور مچاتی میدانوں کی طرف رواں دواں ہے۔ اچھوتے مضمون اور انوکھے قافیے اُس کی دشوار راہیں ہیں۔ سرکردہ افراد، غیر ملکی فرمانروا، مخالف تحریکیں اور بڑے بڑے اخبار اس دشوار راہ کی چٹانیں ہیں۔ ظفر علی ہر

اس چٹان سے ٹکرا گئے جسے باطل سمجھا۔ دُشمن بنانے اور اُسے زیر کرنے میں وہ بڑی مہارت رکھتے تھے۔ دُشمن کی طاقت یا تعداد سے وہ کبھی مرعوب نہ ہوئے اور دُشمنوں نے انہیں اکثر تنہا مگر کبھی حقیر نہ پایا۔ ظفر علی نے سیاست کو پتنگ بازی بنا دیا اور کہنے لگے۔

یہ اک تُکّل اکیلا ہی لڑے گا سب پتنگوں سے

شاعری کو ظفر علی خاں نے محفل، مشاعرہ سے نکال کر اکھاڑے میں لا کھڑا کیا اور صحرائے نجد میں بھٹکتے ہوئے شعر کو غزنی کی راہ پر ڈال دیا۔ غزل کی نزاکت ان پر حرام ہو گئی اور نظم کو انہوں نے زِرّہ پوش کر دیا۔

ظفر علی خاں کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ جس مضمون نے ذرا سا اُکسا دیا اس پر فوراً شعر کہہ ڈالتے۔ ان کی بدیہہ گوئی اور پر گوئی سے کوئی موضوع بھی محفوظ نہ تھا اور یہ بات اُن کی نظموں کے عنوانات سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثلاً متصوّفانہ کنکوے بازی، از میمو تا بہ مانڈلے، ماکیانِ مشرق، زیر بادی،

سنگھٹینے، لبرل اندر سبھا، آزادی کا بگل اور حسن شاہ کی موٹر۔ ان کی جودت انہیں انوکھے مضامیں سجھاتی ہے۔ اور ان کی جدّت اس مضمون کو اچھوتے قافیے مہیّا کرتی ہے۔ ان کے یہاں داؤد غزنوی کا قافیہ بود غزنوی تھا اور گاندھی کا قافیہ مکر کی آندھی سے جاملتا تھا۔ ایک نظم میں حل اور کاجل کے قافیے شروع ہوئے تو کھٹمل اور وڑھیل سے ہوتے ہوئے جھانپل اور بابا ٹل تک جا پہنچے، ایک اور نظم میں چوکھٹ کا قافیہ جھٹ پٹ، صفاچٹ، کھٹ پٹ، تلپٹ، جیوٹ، مرگھٹ اور پرگٹ سے باندھ کر بھی راضی نہ ہوئے اور توسنِ طبع کو فروٹ کیا اور سلہٹ جا نکلے۔ ان کے اشعار میں ادق اور ثقیل قوافی بڑے سُبک اور مانوس لگتے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو لوگ اُسے تُک بند اور زٹل ٹھہراتے مگر ظفر علی خاں کو اہلِ زبان نے کامل الفن کہا اور ان کی پر گوئی اور ندرت کو شاعرانہ اجتہاد کا درجہ دیا۔ ظفر علی خاں کی ندرت مضامین اور قوافی پر ختم نہیں ہو جاتی، وہ نئے استعارے ایجاد کرتے اور طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ٹیپ کے مصرعے بھی ایسے کہے ہیں کہ عجیب ہونے کی وجہ سے بے حد کاٹ دار ہیں اور غریب ہونے

کے باوجود زبان زد خلائق ہو گئے۔ شیخ و برہمن کے استعارے کو وہ دیر و حرم کی بلندیوں سے اُتار کر لنگوٹی اور تہجد کی سطح پر لے آئے۔ لنگوٹی یوں بھی ستر پوشی میں ناکام رہتی ہے اور جب ظفر علی خاں کا ہاتھ اُس تک پہنچا تو اُس کے کھُل جانے پر تعجّب نہ ہوا۔ ظفر علی نے اس پر اکتفانہ کی بلکہ شیخ کے بے تہمدے دیوانہ پن کا مظاہرہ بھی اپنی شاعری میں کر ڈالا۔ اس کی مثالیں اکثر ٹیپ کے مصرعوں میں مل جاتی ہیں۔ جیسے بہت تیری گیدی کی دم میں نمدا اور مست قلندر دھر رگڑا۔ ممکن ہے اِن حوالوں سے ظفر علی کی شاعری کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو جائے جسے دُور کرنے کے لیے بہارستان، انگارستان، چمنستان، جسیات اور زمیندار کے پرانے پرچوں کا مطالعہ لازم ہے۔ سرِ دست یہ چند شعر کافی ہوں گے۔

آج جن کی یہ خطا ہے کہ ذرا کالے ہیں

پی رہے اُن کا لہو جیل کے رکھوالے ہیں

کبھی کولہو کی مشقّت، کبھی چکّی کا عذاب

جس سے ہاتھوں میں بچاروں کے پڑے چھالے ہیں

گوشت اور خون کے پرزے ہیں جو انگریزوں نے

قیصریت کی مشینوں کے لیے ڈھالے ہیں

قید گورے بھی ہیں چوری میں مگر ان کے لیے

جیل سرکار نے گلزار بنا ڈالے ہیں

ہم کسی بات میں کم ان سے نہیں ہیں لیکن

اس کو کیا کیجیے وہ گورے ہیں ہم کالے ہیں

رنگ کے فرق پر موقوف ہے قانونِ فرنگ

یوں نکلتے نئی تہذیب کے دیوالے ہیں

ہو گئے کس لیے کونسل کے سب ارکاں خاموش

وہ بھی کیا اِن ستم آرائیوں کے آلے ہیں

ہو گئیں زندہ روایاتِ احد زنداں میں

دانت ٹوٹے ہیں انہی کے جو خدا والے ہیں

ظفر علی خاں کی شاعری کا دوسرا رُخ بھی ہے۔ پہاڑوں میں بہنے والی سرکش ندی جب میدان میں داخل ہوتی ہے تو ایک پاٹ دار اور نرم رو دریا بن جاتی ہے اس دریا سے کھیت سیر اب اور کشتِ دل ہری ہوتی ہے۔ ظفر علی خاں کی شاعری کا یہ

رُخ نعت کے میدان میں نظر آتا ہے۔ ظفر علی مجموعۂ اضداد تھے اور ان کی نعتیہ شاعری ان کی سیاسی شاعری کی ضد ہے۔ وہاں ہجا، طعن اور پھبتی تھی۔ یہاں جذب و کیف اور مستی ہے۔ ادھر دُشمن ان سے پناہ مانگتا ہے اور ادھر یہ دامنِ دوست میں پناہ لیتے ہیں۔ ایک طرف آورد کا زور شور ہے اور دوسری جانب بس آمد ہی آمد۔ نعت گوئی میں ظفر علی خاں اس درجہ کمال تک پہنچے جو اُن سے بہتر شاعروں کو نصیب نہ ہوا، دراصل نعت کے لیے کمالِ سخنوری سے زیادہ کمالِ جنوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ظفر علی خاں کے پاس وارفتگی کا بڑا وافر سرمایہ تھا۔

ظفر علی کی بیشتر نعتیں بڑی سہل اور پُر معنی ہیں۔ والدِ محترم کی ہدایت کے مطابق میں نے بچپن میں وہ نعت یاد کی جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے؂

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

اس وقت مجھے اس نعت کا ہر شعر بڑا سادہ اور آسان لگا۔ جب کچھ مدّت گزری

اور میں نے تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیا تو اُس کے ایک ایک مصرعے کے پُر مغز ہونے کا پتہ چلا۔ اِسی نعت کے اِس مصرعے کی رہبری میں جس میں ہم مرتبت یارانِ نبیؐ کا ذکر ہے میں تاریخ اور فقہ کے کتنے ہی فروعی اور اختلافی مقامات سے ٹھہرے بغیر گزر گیا۔ البتّہ ظفر علی خاں کی ایک اور نعت کے ایک مصرعے پر میں مدّت تک ٹھہرا رہا۔ پھر ایک روز ہمّت کر کے اُسے ایک خط میں نقل کیا اور لکھا کہ اگر یہ مصرعہ نعتیہ نہ ہوتا تو میں اِسے تمہاری نذر کرتا۔ شاید رشتہ و پیوند میں اٹکے ہوئے دِلوں میں اِسی طرح کے پامال مضمون آتے ہیں اور اچھے نعتیہ شعر صرف اس دل پر القا ہوتے ہیں، جو حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ سے مروی حدیث کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبّت میں کامل ہو جائے۔ ظفر علی خاں عشقِ رسولؐ میں اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں عاشقِ رسولؐ کو یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنّا تمہی تو ہو

ظفر علی خاں کا زمیندار اخبار میں نے بہت کم پڑھا ہے۔ جب اس کا شہرہ تھا میں

اس وقت اتنی مسافت پر رہتا تھا کہ یہ اخبار وہاں دوسرے یا تیسرے دِن پہنچتا تھا۔ روزے آپ قضا کرسکتے ہیں مگر روزنامے کے قضا کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور ہو بھی تو کیونکر ہو جب روزنامہ محض پہلے دِن اخبار کہلاتا ہے اور دوسرے دِن سے ردّی شمار ہوتا ہے۔ ہمارا واسطہ البتّہ پرسوں ایسے اخبارات سے بھی رہا ہے جو روزِ اشاعت ہی سے دوسرے دِن کا اخبار معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ یہی حال زمیندار کا اس وقت ہو چکا تھا جب میں اسے روز کے روز پڑھنے لگا۔ یہ بات قیامِ پاکستان کے ابتدائی ایّام کی ہے جو زمیندار کے آخری ایّام تھے۔ کتابت ناقص اور اخبار بدزیب تھا۔ مصلحت کا یہ عالم تھا کہ اخبار کا مسلک ہر روز تبدیل ہو جاتا اور جس کسی سے دام ملنے کی اُمّید نظر آتی ہے اخبار اس کا بندۂ بے دام بن جاتا۔ خبروں کی صحت کا یہ کمال تھا کہ ایک دِن کسی کا جنازہ نکال دیتے اور اگلے روز اس کے حق میں مسیحائی فرما دیتے۔ ظفر علی خاں کے تازہ اشعار جو پہلے ہر روز شائع ہوتے تھے اب تبرّک بن چکے تھے۔ طنز و مزاح کے کالم میں البتّہ کچھ جان باقی تھی کیونکہ حاجی لق لق ابھی زندہ تھے۔ ایک رات میں زمیندار کے دفتر میں

داخل ہوا۔ مجھے ایک خبر کی تفصیل درکار تھی جس کا ریڈیو پر اعلان ہو چکا تھا۔ دفتر کی حالت دیکھ کر دُکھ ہوا۔ اِن دِنوں دفاتر کے بارے میں میرا علم اور تجربہ بڑا محدود تھا۔ میں نے دہلی میں وائسرائے کا دفتر اور کلکتے میں انگریزی اخبار سٹیٹسمین کا دفتر باہر سے دیکھ رکھا تھا۔ اب جو اُردُو کے مشہور روزنامے زمیندار کے دفتر میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ ایک کمرے میں مدھم سا بلب جل رہا تھا اور ایک کاتب اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک لکڑی کا تخت اور دو چار کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ در و دیوار پر حسرت برستی تھی۔ اگلے کمرے کی حالت بھی ایسی تھی۔ میز اور ڈیسک کچھ ایسے بے ترتیب اور خاک سے اٹے ہوئے تھے جیسے مدّت سے اِن کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئی ہو۔ کمرے کے وسط میں دو آدمی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کام بتایا، جواب ملا کہ اس وقت دفتر میں کوئی نہیں ویسے جو فہرست آپ کو درکار ہے وہ ہمارے دفتر میں ابھی تک نہیں پہنچی۔ جب میں واپس مُڑا تو وہ دونوں بھی کمرے کی بتّی بند کر کے باہر نکل آئے۔ اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ زمیندار کا چراغ گُل ہو گیا۔ زمیندار اخبار کا بڑا سا بورڈ

اُتار کر دفتر کی پیشانی پر زمیندار ہوٹل کا بورڈ لگا دیا گیا۔ میں نے پہلی بار نیا بورڈ دیکھا تو مجھے زمیندار اخبار کے ادارتی عملے کے بہت سے نام یاد آنے لگے، علّامہ نیاز فتح پوری، مولوی وحید الدّین سلیم پانی پتی، غلام رسول مہر، عبد المجید سالک، عبد اللہ العمادی، چراغ حسن حسرتؔ۔ ان لوگوں کی جگہ اب ہوٹل کے بیروں اور خانساموں نے لے لی تھی۔ شاید یہ کوئی ایسا غیر متوقع سانحہ بھی نہ تھا کیونکہ مولانا ظفر علی خاں کی جگہ بھی تو آخر مولانا اختر علی خاں کے حصّے آئی تھی۔ وقت کا سیلاب کسی نسل کے لیے تھم جاتا ہے اور کسی کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کو میں نے آخری بار مری میں دیکھا تھا۔ کمشنر ہاؤس کے نزدیک ایک پھاٹک پر اُن کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ بوڑھے اور علیل ظفر علی خاں کا بس نام ہی رہ گیا تھا۔ کام ان کا پورا ہو چکا تھا اور اس کے تمام ہونے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ میں جب بھی ان کے گھر کے سامنے سے گزرا تو پھاٹک سے ڈھلوان پر نیچے اُترتی ہوئی پہاڑی پگڈنڈی کو ہمیشہ گھورتا کہ شاید ظفر علی خاں نظر

آ جائیں۔ ایک دِن وہ نظر آ گئے۔ رکشا پر بیٹھے ہوئے تھے، جسے دو قُلی آگے ہانک رہے تھے اور دو پیچھے سے تھامے ہوئے تھے۔ مولانا نحیف و نزار تھے، نظر کمزور، ساعت ثقیل، زبان خاموش، سر ہلتا تھا اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ جوانی میں میانہ قامت ہوا کرتے تھے۔ اب بڑھاپے میں پستہ قد نظر آئے۔ رکشا کے قُلی بے خبر تھے کہ ان کی سواری کو مولانا حالی نے نازشِ قوم اور فخر اقران کہا تھا اور ایک قصیدے میں، اے شیر دل، اے ظفر علی خاں کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ رکشا تیزی سے ڈھلوان پر اُتر گیا اور میں آہستہ آہستہ چڑھائی کی طرف روانہ ہوا۔

مولانا ظفر علی خاں کو میں نے پہلی بار علی گڑھ میں دیکھا تھا۔ اُن کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ مدیر اور شاعر، بدیہہ گو اور نعت گو، خطیب اور باغی، وفا کیش اور جفا کش، سیمابی اور ہنگامہ پرور، کہنے والے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر برِّ عظیم میں کسی تحریک کی بنا ڈالنی ہو تو ظفر علی خاں سے کوئی بہتر شخص نہیں ملے گا۔ وہ بلا کی تیزی اور تندہی سے کام کریں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے عمارت تیّار ہو

جائے گی۔ اس وقت انہیں تحریک سے علیحدہ کر دینا چاہیئے وگرنہ وہ عمارت کو جس تیزی سے بناتے ہیں اُسی تیزی سے ڈھانے لگتے ہیں۔ میں نے جب انہیں دیکھا تو وہ ایک تحریک کے معمار کی حیثیت سے یونین ہال میں بیٹھے تھے، ان کی ٹوپی کا پھُندنا جھٹکے کے ساتھ ہلتا تھا۔ ہاتھ بھی ہر وقت حرکت میں تھے اور پہلو بھی بار بار بدلتے تھے۔ نچلا بیٹھنا تو شاید انہیں آتا ہی نہ تھا۔ جب تقریر کے لیے اُن کا نام پکارا گیا تو گویا انہیں چین آ گیا۔ وہ سامنا کرنے میں خوش رہتے خواہ وہ مصائب کا ہو یا مجمع کا۔ اس روز جب وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو سامعین خوش تھے کہ یہ شخص اِسی مادر درسگاہ کا نامور فرزند ہے۔ اِسے سر سیّد نے ایک بار جوشِ مسرّت سے جلسہ گاہ میں اپنے گلے سے لگا لیا تھا اور مولانا حالی نے اس کا قصیدہ لکھا تھا۔ سر سیّد کی بغل گیری کا شرف انہیں طالبِ علمی میں ملا تھا اور قصیدہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔ مسدس کے مصنّف نے اپنی منزلت اور مرتبے کے باوجود ایک نوجوان کی شان میں شعر کہے کیونکہ وہ عالی ظرف اور ہنر شناس بھی تھا۔ مولانا حالی کا پھُوس کی چھت والا بنگلہ یونین ہال کی عمارت کے ساتھ واقع

ہے۔ ممکن ہے کہ جب ظفر علی خاں تقریر کے لیے آئے تو ہال کے کسی مشرقی دروازے سے اُن کی نظر اُس بنگلے پر پڑی ہو اور اُن کے ذہن میں خوشگوار یادوں کے دریچے کھُل گئے ہوں۔ وہ جذبے سے مغلوب ہو کر بولے اور سب کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئے۔ اُن کی تقریر کا موضوع وہ اساسی اور سیاسی قرار داد تھی جسے چند ماہ پہلے مسلم لیگ نے لاہور کے منٹو پارک میں منظور کیا تھا۔ اس تقریر میں قائدِ اعظم کا ذکر کئی بار آیا۔ تقریر کے دوران ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حالیؔ اور قائدِ اعظم کے درمیانی وقفے کا نام ظفر علی خاں ہے۔ تقریر ختم ہوئی تو میں اپنی آٹو گراف البم لے کر اُن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں اُن دِنوں سکول کا طالب علم تھا اور ظفر علی خاں کی خاطر یونیورسٹی کے جلسے میں آ پہنچا تھا۔ ظفر علی خاں نے میری طرف دیکھا اور البم کو چوڑے رُخ پر موڑ کر یہ الفاظ لکھ دیے۔

”بجز اللہ کے اور کسی قوّت سے نہ ڈرو۔ ظفر علی خاں ۲۸ اگست ۱۹۴۰“

اس نصیحت کا حق ظفر علی خاں کو پہنچتا تھا۔ اُن کی زندگی اِسی اصول سے عبارت تھی۔ شہید گنج، کشمیر، حیدر آباد، بلقان، طرابلس، ترکی، کانگرس، شدھی

سنگھٹن، پیری مریدی، ختمِ نبوت، آزادی، پاکستان اور نہ جانے کتنے دوسرے موقف اور موقع تھے، جہاں اُن کی بے خوفی کو جہاد کا درجہ حاصل تھا۔ میں نے ظفر علی خان کا کلام یہ دیکھنے کے لیے اُٹھایا کہ نثر کا وہ مضمون جو انہوں نے میری البم میں لکھا تھا اسے کہیں نظم بھی کیا ہے۔ مجھے کتنے ہی اشعار میں اِس نصیحت کا عکس نظر آیا اور دو چار شعر اِس عبارت کا منظوم ترجمہ معلوم ہوئے۔ مثلاً اقبال کے مرثیے میں ایک شعر ہے

ہر روز دیا اس نے مسلماں کو یہی درس

ہر گز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا

کانگرس سے ناراض ہوئے تو اپنے مخصوص رنگ میں اِس خیال کو یوں باندھا:

ڈرتا ہے تو ایک اللہ سے ڈر

مرنا ہے تو اُس کی راہ میں مر

اس نقطے کو رکھ لے پیشِ نظر

دم مست قلندر دھر رگڑا

میں نے آٹو گراف البم واپس لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ظفر علی خاں نے البم مجھے لوٹانے کے بجائے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک اور شخص کے سامنے کر دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ ابھی اس البم کا دھر رگڑا ہو جائے گا۔ اس روز جلسے میں کئی مشہور آدمی آئے ہوئے تھے مگر نگہِ انتخاب نے صرف ظفر علی خاں کو چُنا تھا۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ آج کسی اور سے دستخط نہیں لوں گا لیکن ظفر علی خاں میرے فیصلے کے پابند کہاں تھے۔ جو نہی البم ان کے ہمراہی کے ہاتھ میں آئی، انہوں نے قلم نکال لیا، پہلے ظفر علی خاں کے لکھے ہوئے کو غور سے پڑھا پھر تیزی سے ان کے نام کے نیچے اِسی ورق پر انگریزی میں اپنے دستخط کیے اور ان کے نیچے یہ تین لفظ لکھ دیےTruir،Endeavour، Hooc۔ مجھے آج تک اس مشہور اجنبی

کا نام اور پتہ معلوم نہیں ہو سکا اور ہوتا بھی کیسے، جب میں نے اس سلسلے میں کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ میں تو یہ سوچ کر چُپ ہو رہا کہ قدرت جو دانے دانے پر مہر لگاتی ہے وہ صفحے صفحے پر دستخط بھی تو ثبت کرتی ہو گی۔

(۷)

میں نے آٹو گراف البم بند کر دی۔ خلا میں نظریں آوارہ پھرنے لگیں۔ ذہن البتّہ ایک خاص نقطہ پر جما ہوا تھا۔ مجھے اُس لمحے بہت کچھ یاد آیا۔

ایک لڑکے کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ وہ بڑا ہٹیلا اور سر پھرا تھا مگر اس نے کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ طبیعت ایسی پائی تھی کہ شرارت کرنے اور سزا پانے میں خوش رہتی۔ ڈانٹ کھا کر فوراً اس کام میں لگ گیا جس سے اُسے منع کیا تھا۔ یہ اُس کی عادت بن چکی تھی۔ ڈانٹنے والا زِچ ہو کر بولا۔ بھلا تُم کب باز آنے والے ہو۔ تم سے بھل منسات کی اُمّید کون رکھے۔ تم تو احراری ہو احراری۔ یوں میں نے احراری کا لفظ پہلی بار سُنا اور اُسے ابدی کا ایک استعارہ سمجھ لیا۔ چند دِنوں بعد

جب میں نے سُنا کہ مولانا محمد علی کو رئیس الاحرار کہتے ہیں اور اقبال کے کلام میں مردِ مومن کے ساتھ مردانِ حر کا ذکر بھی ہے تو اس لفظ کے معنی میں شُبہ پیدا ہو گیا۔ اس شُبے کو پیر جو گوٹھ کی گدّی سے بڑی تقویت ملی کہ وہاں بھی حر کہلاتے ہیں۔ کچھ مدّت اور گزری تو یہ عقدہ کھلا کہ تشبیہ اور استعارے کا درست ہونا ضروری نہیں صرف نادر اور پُر اثر ہونا لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشبیہات اور استعارے کا استعمال ہماری شاعری اور دشنام طرازی میں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچا تو میں نے اشتباہ کو دُور کرنے کی کوشش بے سود سمجھ کر ترک کر دی، مگر اِس کوشش کا ایک فائدہ ضرور ہوا میں نے الفاظ کی درجہ بندی کر لی ہے اور اس طرح بہت سی مشکلات آسان ہو گئی ہیں۔ الفاظ کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ لفظ جو ابن الوقت اور مرزا ظاہر دار بیگ ہوتے ہیں۔ اُن کے معنی وقت اور موسم کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ظالم و مظلوم۔ دوسرے وہ معنی خیز لفظ جن کا مطلب علم اور تجربے کے ساتھ واضح اور وسیع ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً حسن و عشق۔ تیسرے وہ تہہ دار لفظ ہیں جن کا سادہ اور قطعی مفہوم بھی

گرفت میں نہیں آتا مثلاً عوام اور استحصال اس درجہ بندی کے بعد میں نے احرار کو دشنام کے استعارے سے خارج کیا اور تیسری قسم کے الفاظ میں شامل کر لیا۔ اب مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ جماعت احرار نے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۳ء تک کیا کھویا اور کیا پایا اور لوگ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کم از کم میں کوئی رائے نہیں رکھتا۔ آخر یہ کہاں ضروری ہے کہ انسان ہر موضوعِ بحث اور ہر اختلافی مسئلہ پر ایک قطعی اور حتمی رائے کا مالک ہو اور اپنے برتاؤ میں اتنا خشک اور درشت ہو جائے کہ احراری کہلانے لگے۔

جب میں ملتان میں تعینات ہوا تو ضلع کے اہم افراد کی ایک فہرست پیش ہوئی۔ اس میں سرکردہ افراد بھی تھے اور سرکش اشخاص بھی۔ بڑے سے بڑے ٹوڈی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے باغی کا نام درج تھا۔ ایک نام دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ یہ سیّد عطا اللہ شاہ بخاری کا نام تھا۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور اس انجمن کا نام مجلسِ احرار تھا۔ ظفر علی خاں نے اسی مجلسِ احرار کا قافیہ بیزار، اشرار، غلط کار، چندے کے طلب گار اور رسوا سرِ بازار سے ملایا تھا۔ یہ سب کچھ

جانتے ہوئے میں نے اس شخص کا نام جسے بہت سے لوگ امیرِ شریعت کہتے ہیں ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ کر لیا۔ ان دِنوں الیکشن کے انتظامات کی مصروفیت تھی۔ چند ماہ گزرے تو الیکشن اور آئین دونوں منسوخ ہو گئے۔ مصروفیت زیادہ ہو گئی۔ بنیادی جمہوریت اور زرعی اصلاحات کی پہلی قسط کے ساتھ کئی دوسرے سرکاری اور نیم سرکاری کاموں میں یوں لگا رہا کہ سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ کام معمول پر آیا تو یادداشت سے ایک نقطہ ابھرا اور خلش بن گیا۔ شاہ جی سے ملاقات کی خواہش دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اس کا اظہار مُنشی عبد الرحمان خان سے کر دیا۔

مجلسِ احرار کو غیر قانونی قرار دیے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے۔ جماعت اپنے انجام کو پہنچی تو گویا جلسہ برخاست ہو گیا۔ نعرے گم، لیڈر راوجھل، جلوس منتشر۔ ایک دور تھا کہ ختم ہو گیا اور اس کی صرف دو یادگاریں رہ گئیں۔ مجلس کی فرو گزاشتیں اور امیرِ مجلس کی خطابت۔ شاہ جی ملتان میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ان کی تقریریں کچھ قانونِ وقت نے بند کر دیں اور کچھ اس قانونِ قدرت نے جو ہر

بوڑھے آدمی پر لاگو ہوتا ہے۔ شاہ جی کی تقریروں کا بڑا چرچا تھا۔ سُننے والوں کا بیان ہے کہ عشاء سے فجر ہو جاتی، مگر طبیعت سیر نہ ہوتی، خوش الحان اور خوش بیان تھے، عربی، فارسی، اُردو اور پنجابی محاورے پر قادر تھے۔ قرأت، نثر، نظم، لطیفہ، ہجو اور تشنیع کو حسبِ ضرورت استعمال کرتے تھے۔ احتیاط کا دامن اکثر ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور کبھی کبھی اُسے دانستہ اپنے ہاتھ ہی سے چاک کر دیتے اور اِس بات کی بھی پرواہ نہ کرتے کہ یہ کام برسرِ عام ہو رہا ہے یا برسرِ منبر۔

شاہ اپنے زمانے کے سب سے معروف و مشہور مقرّر تھے۔ عوام نے انہیں سر آنکھوں پر رکھا اور خواص نے اُن سے ہمیشہ خم کھایا۔ میں نے اُن کی تقریر کبھی نہیں سُنی مگر اُس کی تعریف اکثر سنتا رہتا اور سوچتا تھا کہ وہ خطابت کس پائے کی ہو گی، جسے مولانا محمد علی، ابو الکلام آزاد اور بہادر یار جنگ کا زمانہ ملا پھر بھی وہ سب پر بھاری رہی۔ مولانا محمد علی، علی گڑھ اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ابو الکلام آزاد الہلال نکالتے اور امام الہند کہلاتے تھے۔ محمد بہادر خاں نوّاب اور جاگیر دار تھے۔ شاہ جی کے پاس کیا رکھا تھا۔ پٹنہ میں داغِ یتیمی، بنارس میں ورق

کوٹنے کی مشقّت اور امرتسر میں ایک چھوٹی سی مسجد کی امامت۔ اس کے باوجود شاہ جی کو جس نے سنا اس نے یہی کہا۔

چہ جادوئیست ندانم بطرزِ گفتارش

کہ بازبستہ زبانِ سخن طرازاں را

فیضیؔ

ذاکر صاحب نے مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ابوالکلام آزاد کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند پیش کرنے کے موقع پر کہا تھا کہ اُردو زبان کو ہمیشہ اُس پر فخر رہے گا کہ وہ آپ کی زبان سے بولی اور آپ کے قلم سے لکھی گئی۔ اُردو نے جب بھی اپنے سرمایۂ افتخار پر ناز کیا تو اُسے بہت سے لوگ یاد آئیں گے۔ اُن میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل ہوں گے جن کے لیے سیاست دراصل ایک سٹیج، سیاسی جماعتیں صرف منتظمینِ جلسہ، ملک بھر کی آبادی محض سامعین اور زندگی ایک طویل اُردو تقریر تھی۔ اس خطیبانہ زندگی میں ان کے ہم عصر تو بہت تھے مگر

ہمسر کوئی نہ تھا۔

عرصہ ہوا میں نے شاہ جی کو ایک بار کراچی میں سُننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، مجھے یہ فکر تھا کہ جلسہ رات گئے ختم ہوا تو واپسی کی بس نہیں ملے گی۔ اتنے میں ضابطۂ فوجداری حرکت میں آیا، جلسہ منسوخ ہو گیا اور شاہ جی غالباً پکڑے گئے۔ بے بسی کی جگہ محرومی نے لے لی۔ یہ اوائلِ ملازمت کی بات ہے جب شاہ جی کے بولنے اور ہمارے سُننے کے دِن تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ خطابت کی راہ میں پیری حائل ہونے لگی اور سماعت کی راہ میں ملازمت کے آداب اور ضابطے حائل ہونے لگے۔ آج اگر تقریر سُنی کی تو کل کیسے سُن سکیں گے جب ہم اس نظام کا حصّہ بن چکے ہوں گے جہاں حسنِ انتظام کا معیار صرف یہ ہے کہ کسی مخالف کی تقریر نہ ہونے پائے۔ تقریر کا جواب تقریر سے دینے میں محنت صرف ہوتی ہے اور یہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ گول باغ اور موچی گیٹ میں پانی چھوڑ دیا جائے۔

شاہ جی کی تقریر سے محروم رہا تو تقریب بہر ملاقات نکال لی۔ یہ ملاقات منشی عبد

الرحمان خان کے ذمّہ تھی۔ انہوں نے شاہ جی سے بات کی تو وہ ٹال گئے۔ کہنے لگے کہ میں ساری عمر انتظامیہ سے لڑتا آیا ہوں، ڈپٹی کمشنر اگر بلانا چاہے تو وارنٹ گرفتاری نکالے۔ منشی صاحب نے مُجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا دیکھیے ہوئی نا احراریوں والی بات۔ یہ ان کی مرضی کہ وہ عہدے کو انتظامیہ کی علامت جانتے ہیں اور انتظامیہ کو ہر حال میں قابلِ ملامت سمجھتے ہیں مگر یہ کہاں کی بالغ نظری ہے کہ عہدے اور عہدہ دار کے فرق سے بھی انکار کر دیا جائے۔ اگر مجھے اُن کی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تو انہیں میری ملازمت سے کیا غرض۔ ایک نوجوان دورِ حاضر کے عظیم خطیب سے ملنے کا خواہش مند ہے اور بوڑھا خطیب اُس کے اشتیاق کا حال پوچھتا ہی نہیں، بس اتنا سُن کر کہ وہ سرکاری ملازم ہے اسے فوراً رد کر دیتا ہے۔ رہا حفظِ مراتب کا سوال تو میں نے پہلے ہی شاہ جی سے حاضری کی اجازت چاہی تھی سلام نہیں بھیجا تھا۔ پیغام بر نے یہ باتیں سُنیں اور اُلٹے پاؤں واپس لوٹ گیا۔ اگلے ہی روز سیّد عطا اللہ شاہ بخاری میرے یہاں مہمان بن کر تشریف لے آئے۔ میں نے موٹر کار کا دروازہ کھولا۔ پہلے ایک

پھڑ کتا ہوا فارسی شعر بر آمد ہوا اور اس کے پیچھے شعر پڑھنے والا اُترا۔ ڈھیلا ڈھالا کھدر کا کُرتا سبز چار خانہ تہہ بند، دیسی جوتی، دراز قد اور دراز ریش، کشادہ جبیں اور خندہ رو۔ شاہ جی نے ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا دوسرے سے کچھ بوجھ اپنے عصا پر ڈالا، کمر ذرا سی خم ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ بر آمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر گیلری سے ہوتے ہوئے ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ کمرے کے دوسرے سِرے تک چلتے گئے اور وہاں پہنچ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ جوتی اُتاری اور پالتی مار لی۔ میں نے انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اُن کی پرانی تصویروں کو یاد کیا۔ دونوں میں تھوڑی سی مشابہت ضرور ہے مگر مناسبت کوئی نہیں۔ کہاں وہ لحیم شحیم گیسو دراز اور عصابر دار جسے دیکھ کر دیو جانس کلبی، برنارڈ شا، ٹیگور اور ٹالسٹائی یاد آتے تھے اور کہاں یہ سُتا ہوا بے وزن ڈھانچا جو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے شاہ جی سے اپنے اشتیاق کا قصّہ بیان کیا۔ اُن کی تقریر کبھی نہیں سُنی مگر اس کی تعریف اتنی سُنی ہے کہ زبانِ خلق پر ایمان لے آیا ہوں۔ جس نے اُن کی

تقریر سُنی اور پسند کی اس کے لئے علم حاضر اور جس نے کبھی نہ سُنی مگر اوروں
سے زیادہ متاثر ہوا اس کے لئے ایمان بالغیب، شاہ جی نے میری بات کا اعتبار اور
میرے جذبات کا احترام کیا۔ وہ ذرا سی دیر میں یوں گھُل مل گئے گویا میری نیاز
مندی کو ایک زمانہ بیت چکا ہو۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو اُن کی بیماری اور کمزوری
کے پیشِ نظر میں نے اُسے طول دینے سے احتراز کیا مگر جب باتیں ختم ہوئیں تو
شام ہو چکی تھی اور شاہ جی کو آئے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ گفتگو کا سلسلہ
لمحہ بھر کے لیے بھی منقطع نہ ہوا اور اس میں میرا حصّہ اسی قدر تھا جتنا ایک
میزبان اور سامع کا ہونا چاہیئے۔ منشی صاحب محض سُننے اور سر دُھننے کے قائل
نہیں۔ ان کا اصول ہے کہ اچھا انسان، اچھی کتاب اور اچھی گفتگو جہاں میسر
آئے اُس میں دوسروں کو بھی شریک کرو۔ ان سے تنہا فائدہ اُٹھانا کم ظرفی کی
دلیل ہے۔ ملاقات شروع ہوئی تو مُنشی صاحب مُسکرا رہے تھے۔ گفتگو شروع
ہوئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئے، پھر کاغذ نکالا اور یادداشت لکھنے میں مشغول ہو گئے۔
وہ جو ایک نوجوان اور تھا وہ تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ چائے دو تین بار آئی مگر

یوں دبے پاؤں کہ گفتگو میں کوئی خلل نہ پڑا۔ ان تین گھنٹوں میں شاہ جی نے آیات، احادیث، اشعار اور چُٹکلوں سے ایک جادُو جگائے رکھا۔ میں اُن کی خطابت کا راز جاننا چاہتا تھا مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ موضوع اتنی تیزی سے بدلتے رہے کہ خطابت پر جم کر بات نہ ہو سکی۔ گفتگو شاہ جی کی صحت سے شروع ہوئی اور توکّل سے ہوتی ہوئی سیرت تک پہنچی، وہاں سے تاریخ کا ذکر آ گیا اور اس میں مختلف تحریکیں شامل ہو گئیں۔ ہر تحریک کے ساتھ اس سے وابستہ افراد کا جائزہ شروع ہو گیا اور بات ایک پورا چکّر لگا کر شاہ جی کی ذات پر واپس آ گئی۔ اس مرحلے پر شاہ جی نے واپس جانے کی اجازت چاہی۔ ملاقات ختم ہونے والی تھی، اس وقت شاہ جی جوتیاں اُتارے صوفے پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ ابھی وہ پیر نیچے اُتاریں گے، چڑھی ہوئی آستین بھی نیچے اُترے گی۔ گلے کا بٹن بند ہو گا۔ پان کی ڈبیہ جیب میں ڈالی جائے گی اور پھر وہ عصا کا سہارا لے کر اُٹھیں گے جو تمام عرصہ اُن کے ہاتھ ہی میں رہا تھا۔ میں نے کہا اجازت ہو تو چند سوال پوچھ لوں۔ اجازت ملی تو میں نے دو سوالوں سے تمہید باندھی اور جواب ملنے پر تیسرا سوال

داغ دیا۔ اس سوال و جواب کے دو سال بعد میں نے منشی صاحب کو خط لکھا کہ اپنی تحریری یادداشت مجھے بھیج دیں۔ منشی صاحب نے بہت ڈھونڈا مگر ایک مختصر ورق کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ وہ گفتگو جسے میں نے محفوظ سمجھا تھا اس کے الفاظ گم ہو گئے۔ اگرچہ اس کا حاصل حافظے میں محفوظ ہے اور اُس کا تاثر دِل پر نقش ہے۔ مشاہیر کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے سلسلے میں حافظے پر زیادہ اعتبار کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ حافظہ بھی خواہشات کا تابع ہوتا ہے اور بسا اوقات خواب و خیال کو واقعات اور واردات میں منتقل کر دیتا ہے۔ ایسے میں اس کا کہا مانیں تو نفس اور تاریخ دونوں کا زیاں ہوتا ہے۔

میں نے شاہ جی سے جو سوال کئے وہ سب سود و زیاں کے بارے میں تھے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ گزشتہ چالیس برس میں جو آپ کی عوامی زندگی پر محیط ہیں، آپ نے برِّ عظیم کے مسلمانوں کو اسلام سے قریب آتے ہوئے دیکھا ہے یا دور جاتے ہوئے پایا ہے۔ جواب ملا کہ مسلمانوں میں دو طبقے پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں، ایک مذہب سے قریب دوسرا اس سے کچھ دور۔ ان دونوں طبقوں کا درمیانی

فاصلہ اس چالیس سال میں بہت بڑھ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو لوگ مذہب سے بیگانہ ہیں اُن کی تعداد اور قوّت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ میں نے دوسرا سوال پوچھا۔ برِّ عظیم کی گزشتہ چالیس سالہ تاریخ میں زندگی کے کتنے ہی شعبوں میں ایسے نامور مسلمان ایک ہی وقت میں جمع ہو گئے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر اُن سب کی موجودگی میں اسلام سے بیگانہ ہو جانے والوں کی تعداد اور قوّت میں اضافہ ہوا ہے تو اس مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس کے مسائل آپ کے عہد سے زیادہ اُلجھے ہوئے اور رہنما آپ کے معیار سے کم پایہ ہوں گے۔ کیا یہ بات قابلِ افسوس نہیں کہ جو ملّی سرمایہ آپ کو اسلاف سے ملا تھا اس سے آپ کا ترکہ کمتر ہو گا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ ہمیں اپنے مقصد میں اس لیے کامیابی نہ ہو سکی کہ دو سو برس کے عرصے میں فرنگی کی تعلیم اور تہذیب نے اپنا پورا تسلّط جما لیا تھا۔ آسودہ حال لوگ علی گڑھ کی طرف چلے گئے اور ناکارہ آدمی دینی مدارس کے حصّے آئے۔ جنگِ آزادی کی ہمہ ہمی میں سیاست دین پر اور منافقت دنیا پر غالب آئی۔ ساری توجّہ اور توانائی نئی تعلیم اور نئی سیاست کی

نذر ہو گئی۔ جو لوگ باقی رہے اُن میں سے کچھ ہندو تمدن کے زیرِ اثر رہ کر گمراہ ہو گئے۔ صرف بچے کھچے اور لٹے پٹے لوگ ہی دین کے قافلے میں شامل ہوئے۔ ہمارا سرمایہ خوب تھا مگر نسل ناخوب تھی، نتیجہ ظاہر ہے۔ آبائی ورثہ بھی کھویا، اپنی کمائی بھی گنوائی اور مستقبل کو بھی مخدوش بنا دیا۔ میں نے آخری سوال کی اجازت چاہی اور اسے دو طرح سے پوچھا، ایک شکل یہ تھی کہ اگر قیامت کے دِن آپ سے پوچھا گیا کہ اے وہ شخص جسے بیان و کلام میں چالیس کروڑ افراد پر فوقیت دی گئی تھی اس خطابت کا حساب پیش کرو تو آپ ناکام تحریکوں کے علاوہ کیا پیش کریں گے۔ اسی سوال کی دوسری شکل یہ تھی کہ آپ نے اپنی جدوجہد کا انجام دیکھ لیا۔ اب اگر زمانہ چالیس برس پیچھے لوٹ جائے تو آپ اپنی خطابت اور طلاقت کا دوبارہ وہی استعمال کریں گے یا آپ کی زندگی بالکل نئی ہو گی۔ شاہ جی یکایک خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی میں آزردگی بھی شامل تھی۔ میں نے موضوع بدل دیا اور اپنی آٹو گراف البم اُن کے سامنے کر دی۔ شاہ جی نے اسے پہلو پر رکھا اور لکھا

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اوّل اوّل وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر

قیامت کا طوفان صحرا میں اوّل غبارِ رہِ کارواں آخر آخر

چمن میں عنادل کا مسجود اوّل اور گیاہِ رہِ گُلرخاں آخر آخر

ان تین اشعار کے نیچے ایک طویل کشش کے ساتھ سیّد لکھا اور سیّد کے اوپر عطاء اللہ بخاری لکھ کر دستخط مکمل کر دیے۔ یہ بات ۲۸ جون ۱۹۵۹ء کی ہے۔ دو تین برس بعد میں اور منشی عبد الرحمان خاں اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ شاہ جی زندہ تھے تو اپنے سامعین کو کبھی بنجر زمین کبھی صحرا اور کبھی قبریں کہہ کر پکارتے تھے۔ آج ہم اُن کے سرہانے خاموش کھڑے تھے۔ قبر سے آواز آئی تمہارے تیسرے سوال کا جواب اس روز دے نہ سکا تھا، لو آج سنو، الفاظ اقبال کے ہیں قصّہ مسلم ہندی کا اور حاصل ایک عمر کی خطابت کا۔

مسلم ہندی چرا امید اں گذاشت

ہمت او بوئے گزاری نداشت!

مشت خاکش آنچناں گردید و سرد

گرمئ آوازِ من کارے نہ کرد!

(۸)

میں نے آٹو گراف البم پھر اُٹھالی، ورق گردانی شروع ہوئی اور ہر ورق سے کوئی شخصیت یا کوئی یاد اُٹھ اُٹھ کر گلے ملنے لگی۔

ٹوکیو کے ایک بڑے اسٹور سے میں نے چند کتابیں خریدیں۔ اُن کا موضوع آرائشِ گُل تھا۔ اِس فن میں اہلِ جاپان نے اتنا کمال حاصل کر رکھا ہے کہ جن دِنوں فاتح امریکی جنرل میکارتھر اپنے فوجی ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر جاپانیوں کو جمہوریت سکھا رہے تھے، اُن کی بیوی آرائشِ گُل کے ایک مکتب میں زیرِ تربیت تھیں۔ امریکہ نے جاپان کو جہاں بانی کا سبق دیا اور جاپان نے باغبانی کا۔ جاپان

میں جمہوریت کا پودا تو لگ گیا مگر مغرب کے پھولوں کو مشرق کی بہار میسّر نہ آ سکی۔ میں نے یہ کتابیں ایک بڑے ڈھیر سے تلاش کی تھیں۔ ان میں سجاوٹ کی تاریخ بھی تھی اور سجاوٹ کے تین مستند مدرسوں کی تعریف بھی۔ مگر جو کتاب مُجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ خزاں زدہ پھول پتّوں، خشک گھاس اور سوکھی ہوئی شاخوں سے دِلفریب گُلدستے بنانے کے بارے میں ہے۔ وہ جو ہمارے یہاں خس و خاشاک کہلاتا یا کوڑا کرکٹ سمجھا جاتا ہے اہلِ جاپان اُس میں بھی حسن اور خوشنمائی تلاش کر لیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ حسن جسے ہم اشیا میں ڈھونڈتے ہیں وہ دراصل نظر میں ہوتا ہے تر و تازہ پھولوں سے موسمِ بہار کے مختصر وقفے میں ہر ایک مالی گُلدستے بناتا اور ہر ایک مالن گجرے پروتی ہے مگر سرما اور خزاں کے موسم میں زرد اور سیاہ، خشک اور بے جان پھول پتّی سے ترتیب و توازن کے فن پارے بنانا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ میں نے اس کتاب کو نادر تحفہ جانا اور کراچی پہنچ کر عذرا کو اِس مصرعہ کے ساتھ پیش کر دیا۔

کہ گُل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

یہ مصرعہ مجھے موضوع کی مناسبت سے موزوں معلوم ہوا، گویا مصرعے اور تحفے دونوں کا حق ادا ہو گیا ہو۔ میں نے پہلی بار یہ مصرعہ ضربِ کلیم کے انتساب میں دیکھا تھا اور اس وقت کی سوجھ بوجھ کے مطابق مجھے مبالغہ آمیز اور ناموزوں لگا۔ اتنا خوبصورت مصرعہ اور اُسے اقبال نے اپنے سرمایۂ بہار کے ساتھ آخر بھوپال کے نوّاب کو کیوں پیش کر دیا ہے۔ مجھے یہ اچھا نہ لگا کہ اقبال ایک نوّاب کی تعریف میں اتنی بڑی بات کہہ دیں اور دیارِ شعر کی ولایت ایک والیٔ ریاست کے نام لکھ دیں۔ نوّاب کا لفظ اپنے لغوی معنی کے ساتھ ساتھ اصطلاحی معنی بھی رکھتا ہے اور ایک ایسے کردار کی علامت بن گیا ہے جو بدکرداری میں اپنی مثال آپ ہو۔ نوّابوں کے بارے میں میرے اوّلین خیالات دو کتابوں سے مُستعار ہیں۔ ایک کے ایل گابا کی ہرہائی نس اور دوسری دربارِ حرام پور۔ یہ کتابیں مجھے ناپختگی کے دَور میں دیکھنے کا موقع ملا اور اگرچہ ان کا مضمون اور متن بھول چکا ہوں تاہم اِن کا اثر بدستور برقرار ہے۔ دربارِ حرام پور ہمارے سکول کے کتب خانے میں موجود تھی اور ایک دِن حادثے کے طور پر میرے نام جاری ہو گئی۔ اس کا جو اثر

قائم ہوا وہ نوّاب صاحب کی عیاشی کا نہیں بلکہ اُن کے ظلم و ستم کا تھا۔ میں نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ ریاستی اور درباری نہیں ہوں، اور آزردہ ہوا کہ نمرود بیسویں صدی میں بھی ملتے ہیں اور حضرت ابراہیم کا زمانہ ما قبل تاریخ کہلاتا ہے۔ ایک شخص کو محض پیدائش کے اتّفاق کی بدولت دوسروں کے جان و مال اور عزّت و آبرو پر خداوندی کا اختیار کیوں مل جاتا ہے۔ قیامت کیوں نہ آ جاتی۔ قیامت پر میں ایمان رکھتا ہوں مگر یقین یہ کہتا ہے کہ قیامت کا ظلم و جور سے کوئی تعلّق نہیں وگرنہ کب کی آ جاتی۔ اس چھوٹی سی کتاب میں عیّاشی کا بہت ذکر تھا اور اس کی بہت سی مثالیں درج تھیں۔ بیشتر ان دِنوں سمجھ میں نہ آئیں اور اب صرف اتنا یاد ہے کہ نوّاب صاحب جب سیڑھیاں چڑھتے تو زینے کے دونوں جانب برہنہ عورتیں کھڑی ہوتی تھیں جن کے گدرائے ہوئے بدن کا سہارا لے کر وہ اوپر چڑھتے تھے۔ اوپر چڑھنے کا یہ طریقہ اب بھی رائج ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دست درازیاں صاحبِ اقتدار کی ہوتی ہیں اور ترقّی کے زینے پر قدم صاحبِ غرض کا ہوتا ہے۔

گابا کی کتاب میں نے پڑھی نہیں صرف دیکھی اور سُنی ہے۔ ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں امرتسر آیا اور جہاں ٹھہرا وہاں ایک نوجوان اس کتاب کے مطالعے میں غرق تھے۔ میں ان کے انہماک سے متاثر اور ان کی راز داری سے خائف ہوا۔ وہ کتاب کو سب سے چھپا کر پڑھتے تھے۔ انہوں نے کتاب کا تعارف یوں کرایا کہ والیانِ ریاست اس کا پورا ایڈیشن خرید کر جلا دیتے ہیں۔ اُس کے واقعات بڑے دلچسپ اور انشا بڑی دلفریب ہے۔ انہوں نے مجھے کتاب کا ایک جملہ سُنا کر رُخصت کر دیا۔ میں کمرے سے باہر آیا تو انہوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہ ایک شخص کی محفلوں کا ذکر دوسرا شخص صرف بند کمرے میں پڑھ سکتا ہے۔ میں دروازے کے پاس کھڑا رہا اور میرے کانوں میں کتاب کا واحد جملہ جو میں نے سُنا تھا دیر تک گونجتا رہا۔ جملہ کچھ یوں تھا کہ انگریز کا ناشتہ انڈے اور چائے، امریکی کا ناشتہ دلیہ اور کافی، فرانسیسی کا ناشتہ پیسٹری اور قہوہ مگر ہز ہائی نس صُبح سے ناشتے میں دوشیزہ پسند کرتے ہیں۔ میں نے کان بند کر لیے اور اپنی آٹو گراف البم کرنل ائیر کموڈور ہز ہائی نس نوّاب سکندر صولت افتخار الملک

محمد حمید اللہ خاں بہادر جی سی ایس آئی، جی سی آئی ای، سی وی او، بی اے، ایل ایل ڈی، چانسلر چیمبر آف پرنسز کے سامنے رکھ دی۔ نوّاب بھوپال نے بڑی خندہ پیشانی سے وہ البم میرے ہاتھ سے لی اور اُسے میز پر رکھ کر انگریزی میں حمید اللہ لکھ دیا۔ بڑی روانی اور خوشخطی کے ساتھ۔ نام کے سارے لفظ صاف پڑھے جاتے ہیں۔ پہلا لفظ ترچھا ہے اور آخری لفظ کے بعد ایک لکیر تھوڑی سی آگے جانے کے بعد پیچھے کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ لکیر نام کے آدھے حصّے تک جاتی اور پھر اُس خط پر ذرا دور لوٹ کر گُم ہو جاتی ہے۔ دستخط پر نظر ڈالیں تو پس منظر میں ایک حسن اور قرینہ نظر آتا ہے۔ اس دستخط میں حرارت بھی ہے۔ آج بھی یہ کسی زندہ شخص کے دستخط لگتے ہیں حالانکہ نوّاب بھوپال کے انتقال کو کئی برس ہو چکے ہیں۔ مجھے اس خوبی پر حیرت ہوتی ہے کیونکہ میں نے والیانِ ریاست کو زبانی حکم لگاتے، کاتب سے فرمان لکھواتے اور اُس پر مہر ثبت کرتے دیکھا ہے۔ یہ مہریں مُردہ اور بے جان ہوتی ہیں اور شاہی فرمان کے مزار پر تعویذ کا کام دیتی ہیں۔

نوّاب بھوپال نے سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ ایک عام آدمی کی طرح محفل میں شامل تھے۔ لمحہ بھر کے لیے بھی یہ احساس نہ ہوا کہ یہ اس قبیلے کے رُکن ہیں جن کی آراستہ پیراستہ تصویریں درجنوں کے حساب سے ہر سال سٹیٹسمین ائیر بُک میں چھپا کرتی ہیں۔ راجے مہاراجوں کی یہ تصویریں تفریح اور عبرت کا سامان ہوتی تھیں۔ بل دار پگڑیاں، سُرخاب کے پَر، گلے میں موتیوں کے ہار، سینے پر تمغے اور کہیں کہیں کانوں میں چھلّے۔ یہ نوّاب ان بہروپیوں سے مختلف نکلا۔ ابھی یہ خاموش بیٹھا ہے جب تقریر کرنے کے لیے اُٹھے گا تو ایک پرانے علیگ کے علاوہ اُس کی ہر حیثیت ماند پڑ جائے گی۔ نوّاب بھوپال نے تقریر اُردُو میں کی۔ وہ نرم گفتار اور کم سخن نکلے۔ مختصر تقریر، چھوٹے چھوٹے جملے، بیان اور فکر میں سادگی۔ تقریر دلچسپ اور دِل نشیں تھی۔ یہ تقریر میں نے ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء کوئی سُنی تھی اور آج بھی اُس کے دو جملے دل میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اِس وقت سے اب تک کتنی ہی دھواں دھار تقریریں سُنی ہیں مگر ذہن انہیں محفوظ کرنے سے انکار کرتا ہے۔ تقریریں شروع ہوئی تو حمید اللہ خاں نے کہا کہ طالبِ

علمی کا سنہرا دور ختم ہوئے مدّت ہو چکی ہے اور اب میں اولڈ بوائے کہلاتا ہوں۔ مگر اس درس گاہ کی فضا میں نہ جانے وہ کون سی خاصیت ہے کہ جونہی یہاں قدم رکھتا ہوں گزرا ہوا زمانہ اُلٹے پاؤں لوٹ آتا ہے۔ ابھی یونین ہال میں بیٹھے ہوئے مجھے اپنی طالبِ علمی کے زمانے کی ایک تقریر یاد آئی۔ سارا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا اور الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ ایسے لگا گویا میں نے وہ تقریر ابھی کی ہو۔ اس وقت میں حیران ہوں کہ آپ نے مجھے فوراً ہی دوبارہ تقریر کے لیے کیوں بُلا لیا ہے۔ حمید اللہ خاں نے بڑی سچّی بات کہی۔ علی گڑھ میں گزارا ہوا زمانہ کبھی ماضی بعید کے صیغے میں نہیں آتا۔ بیشتر وقت وہ حال کا صیغہ ہوتا ہے اور اگر فراموش بھی ہو جائے تو ماضی قریب بن کر رہتا ہے۔ طالبِ علمی کے زمانے کو بھی یاد کرتے ہیں مگر وہ شدّت اور لذّت جو علی گڑھ کی یاد میں ہے وہ کیا کسی دوسری درس گاہ کو نصیب ہو گی۔ اس احساس کا دوسرا مظاہرہ حمید اللہ خاں نے اپنے آخری جملے میں کیا تھا۔ صاحبِ صدر سے کہنے لگے آپ کا ہاتھ میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کے قریب آ گیا ہے۔ اِس گھنٹی کے بجتے ہی مقرّر کو اپنی تقریر ختم کرنا

پڑتی ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں آپ اسے بجانہ دیں کیونکہ اب میں گھنٹی کی آواز نہیں بلکہ محض اشارے سے سمجھ جاتا ہوں کہ مجھے بس کرنا چاہئے۔ حمید اللہ خاں یہ کہہ کر سٹیج سے نیچے اُتر آئے۔ ترکِ کروفر کے لیے جس سوجھ بوجھ ظرف اور ہمّت کی ضرورت ہوتی ہے وہ عام نہیں۔ عام بات تو یہ ہے کہ سٹیج پر کھڑے اور کرسی پر بیٹھے ہوئے کسی شخص کا جی نہیں چاہتا کہ وہ انہیں چھوڑ دے۔ لوگوں کے اشارے اور آوازے کام نہیں آتے۔ ان بزرگوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ایک قیامت ہوتی ہے اور اس کے لیے صور پھونکنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ غالب کے پیرو ہوتے ہیں اور اُن کے گھر کی رونق ہمیشہ ایک ہنگامے پر موقوف ہوتی ہے۔ پہلے حصولِ اقتدار کی کشمکش، پھر وصلِ اقتدار کا جشن، بالآخر موقوفی کا ہنگامہ۔

حمید اللہ خاں نے برِّ عظیم کی آزادی سے چند ماہ قبل بڑا مصروف زمانہ گزارا، وہ ہر اہم سیاسی گفتگو کا حصّہ تھے، کبھی مسلمان کی حیثیت سے، کبھی ایوان والیانِ ریاست کے صدر کی حیثیت سے، کبھی متوقع بھارتی شہری کی حیثیت سے اور کبھی اہم اور مخالف لیڈروں کے ذاتی دوست کے طور پر، جب مذاکرات ختم

ہوئے تو حمید اللہ خاں نے دیکھا کہ بساط اُلٹ چکی ہے۔ تقریر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ گھنٹی بجنے والی ہے۔ وہ خاموشی سے اسٹیج سے اُتر آئے اور چند سال وضعداری سے بسر کرنے اور موقع پرستی کو رد کرنے میں گزار کر اِس جہان سے رُخصت ہو گئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہیں لکھا ہے کہ جب اُس نے نوّاب صاحب سے بھارت میں ایک بڑے عہدے کو قبول کرنے کی بات کی تو انہوں نے معذرت چاہی اور کہا کہ وہ اسلامی دنیا میں کسی اہم خدمت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری ایّام میں نوّاب بھوپال دنیائے اسلام کی کوئی نمایاں خدمت نہ کر سکے مگر نیّت کا اجر انہیں ضرور ملے گا۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی کہتے ہیں کہ انہیں اس بات کا اجر بھی ملے گا کہ وہ اس جنّت کی تلاش میں جو ماں کے پاؤں تلے ہوتی ہے، اپنی والدہ کی قبر کی پائنتی دفن ہوئے ہیں۔ قیامت تک وہ سر جس پر عہدِ انگلیسی کی ایک بڑی دیسی ریاست کا تاج رکھا ہوا تھا اب ماں کے قدموں میں خاک پر رکھا رہے گا۔ اُن کی والدہ سلطان جہاں بیگم تھیں جن کے نام شبلی نے سیرۃ النّبوی ؐ معنون کی تھی۔ حشر کے دِن بہت سے لوگ اعمال نامے ہی نہیں،

کتابیں لیے ہوئے بھی کھڑے ہوں گے۔ سر سیّد کے ہاتھ میں مسدّس حالیؔ کا نسخہ ہو گا۔ سلطان جہاں بیگم نے سیرۃ النّبویؐ کی جلدیں اُٹھائی ہوں گی۔ حمید اللہ کے ہاتھ میں ضربِ کلیم ہو گی۔ مغفرت کے بھی خدا نے کیا کیا سامان پیدا کیے ہیں۔

(۹)

میری آٹو گراف البم میں ایک نوّاب کے علاوہ ایک عدد راجہ کے دستخط بھی ہیں۔ نوّاب اور راجہ میں صرف نام کا فرق ہے۔ کہنے کو ایک مسلمان اور دوسرا ہندو ہوتا ہے مگر حرام پور کے حرم اور اندر کے اکھاڑے کا مسلک ایک ہوا کرتا ہے۔ میں جس راجہ کا ذکر کر رہا ہوں وہ شریف اور نجیب ہیں اور ان کا تعلّق اُودھ کی تعلّق داری اور لکھنؤ کے امام باڑے سے ہے۔ اُن کے والد ایک درد مند مسلمان رہنما تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد نوجوان راجہ کو جاگیر اور سیاست ورثے میں ملی، کچھ ترکہ درد مندی اور ہوش مندی کا بھی اُن کے حصّے آیا۔ وہ جاگیر بھارت میں چھوڑ آئے، سیاست پاکستان آ کر ترک کر دی، ہوش مندی ہنوز اُن کے

ساتھ ہے، درد مندی کا اب پتہ نہیں ملتا۔

قائدِ اعظم نے جب مسلم لیگ کو از سرِ نَو منظّم کیا تو نوجوانوں کی ایک پوری نسل اُن کے ہمراہ تھی۔ اِن جوانوں میں سب سے طرح دار راجہ آف محمود آباد تھے۔ جب میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تو وہ سفید انگرکھے میں بڑے بانکے نظر آئے۔ انگرکھے کو میں زوال کی نشانی سمجھتا ہوں اور کسی کو پہنے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ لباس تو صرف فسانۂ آزاد کے کرداروں پر ہی سجتا ہے۔ انگرکھا پہنئے اور بٹیر لڑائے۔ یہ کیا کہ اِس لباس کو پہن کر کوئی مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین میں آ نکلے۔ ہمیں یوں لگا کہ راجہ صاحب سے غلطی ہو گئی ہے۔ راجہ صاحب خاموش بیٹھے تھے۔ بہت دیر بعد اُن کی باری آئی۔ وہ بولے اور ہمیں پتہ چلا کہ ہم غلطی پر ہیں۔ تا مردے سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد۔ ایک جوشیلی تقریر ہوئی، اسلام کی سربلندی کا عزم، انگریز سے آزادی چھین لینے کا دعویٰ، ہندو اکثریت سے مرعوب نہ ہونے کی نصیحت۔ کہنے لگے کہ اِس راہ میں وہ ہر قربانی دینے کے لیے تیّار ہیں۔ ان کی جان بھی حاضر ہے اور یہ چلی بھی جائے تو حق ادا نہ

ہو گا۔ وہی غالبؔ والا خیال راجہ صاحب نے نثر میں باندھا تھا۔ ہم نے سالہا یہ مضمون اور یہ بات سُنی۔ اِن دِنوں کوئی اِس سے کم تر دعویٰ کرے تو ہم اُسے زورِ بیان یا منافقت سمجھ کر چُپ ہو رہتے ہیں۔ وہ زمانہ اور تھا، سب کچھ بول رہے تھے اور سُننے والے اعتبار کرتے تھے۔ ایک مقرّر تاکید کرتا تھا اور دوسرا تائید۔ ایک کو سُنا تو آگہی میں اضافہ ہوا اور دوسرے کو سُنا تو ایمان تازہ ہو گیا۔ ہمیں ہر وہ شخص عزیز تھا جس کی زبان پر یہ پیغام ہو۔ راجہ صاحب عزیز تر تھے کہ وہ قائدِ اعظم کے خصوصی پیغامبر تھے۔

راجہ صاحب کو قدرت نے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ صحت اور جوانی، دِل اور دماغ، گُفتار و کردار، درہم و دینار، تعلقہ داری اور عزّا داری۔ ہمارا تعلّق اُن کی سیاست سے رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا۔ راجہ صاحب بارہا علی گڑھ آئے اور ہر بار اُن کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ پھر وہ دِن بھی آ گئے جب سیاست میں اُن کی ولایت اتنی بڑھی کہ اُس کے مقابل محمود آباد کا تعلّقہ بہت چھوٹا سا رہ گیا۔

پاکستان بنا تو راجہ صاحب کراچی آ گئے۔ سبھی کو اُن سے بڑی اُمّید تھی۔ خیال تھا کہ اگر وہ اِس کے بنانے میں یوں کوشاں رہے ہیں تو اب اِس کی تعمیر میں بھی وہی جانفشانی دکھائیں گے۔ لیکن راجہ صاحب سیاسی مسائل کو حل کرنے کے بجائے خود معمّا بن کر رہ گئے۔ کچھ عرصہ وہ خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہے اور اُن کی بے غرضی اور وضع داری کو داد ملتی رہی۔ انتظار کی گھڑیاں سالوں میں بدل گئیں اور چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ راجہ صاحب بھی وقت کے ساتھ بدل گئے ہیں۔ ملّت کی حیاتِ نَو کا طلبگار محض زندگی بیمہ کا ایجنٹ بن کر رہ گیا۔ راجہ صاحب بغداد، لندن، مسلم سنٹر اور ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی کے ہو کر رہ گئے۔ لوگ آہستہ آہستہ اُنہیں بھولتے چلے گئے۔ گاہ گاہ جب وہ لندن سے آتے ہیں تو ہر بار یہ افواہ گشت کرتی ہے کہ اِس بار راجہ صاحب ضرور پاکستانی سیاست میں حصّہ لینے والے ہیں۔ پچھلی مرتبہ جب یہ چرچا ہوا تو اکثر سُننے والوں نے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ بیس برس تک شیر آیا شیر آیا کا شور مچانے والے اِس سوال پر حیران ہوئے۔ حالانکہ نئی نسل نے صرف اِتنا پوچھا تھا کہ یہ شیر کون سے جنگل کا

راجہ ہے۔

راجہ صاحب کے سیاست میں حصّہ لینے کا وقت گزر گیا تو خواہش ہوئی کہ اب اُن سے گزرے ہوئے دِنوں کی بات کی جائے۔ اُن دِنوں کی بہار راجہ صاحب نے خود دیکھی ہے اور اُسے بیان کرنے کا ڈھنگ بھی اُنہیں آتا ہے۔ میری یہ دیرینہ خواہش کراچی میں پوری ہوئی۔ وہ مجھے ۸ اگست ۱۹۷۰ء کو رات کے کھانے پر ملے۔ وہ بڑی شفقت سے پیش آئے اور دوسرے مہمانوں کو چھوڑ کر بیشتر وقت مُجھ سے باتیں کرتے رہے۔ باتیں قائدِ اعظم کے بارے میں تھیں اِس لیے تحریکِ پاکستان کے مختلف پہلو زیرِ بحث آتے رہے۔ راجہ صاحب نے قائدِ اعظم کی عُمر اور اُن کی صحت کا حال بیان کیا۔ خیال تھا کہ وہ یہ ثابت کریں گے کہ ایک نحیف و نزار جسم میں ایک ایسا دِل بھی ہو سکتا ہے جو نا قابلِ شکست اور نا قابلِ تسخیر ہو۔ مگر راجہ صاحب اِس عام راہ پر کب چلنے والے تھے۔ کہنے لگے کہ قائدِ اعظم کو ۱۹۴۵ء میں تپ دق کا مرض ہو گیا تھا اور اِس راز کا علم صرف مِس فاطمہ جناح اور ڈاکٹر رحمان کو تھا۔ میں اِس انوکھی خبر پر چونکا اور بولا کہ قائدِ اعظم کے

عزم و ہمّت کی داد دینی پڑتی ہے کہ جب اُن کا جسم اندر سے پگھل رہا تھا، وہ دُشمنوں کے سامنے چٹّان بن کر کھڑے ہو گئے۔ راجہ صاحب نے اِس بات سے پوری طرح اتّفاق نہ کیا بلکہ اختلاف کی ایک نئی راہ کی طرف یوں اشارہ کیا کہ بہت سے فیصلے قائدِ اعظم نے عجلت میں کیے ہوں گے کہ شاید موت کسی اور فیصلے کے لیے مہلت ہی نہ دے۔ میں نے اِس بات پر تعجّب کا اظہار کیا جو اختلاف کی ایک مؤدبانہ صورت ہے۔ راجہ صاحب اسے خاطر میں نہ لائے اور کلام جاری رکھا۔ کہنے لگے کہ جب ہندوستان کے آخری وائسرائے نے اپنا قطعی فیصلہ قائدِ اعظم کو سُنایا اور ایک ایسے پاکستان کی پیشکش کی جس کا حدود اربعہ نادرست اور نا مکمل تھا اور کہا کہ یا اِس کٹے پھٹے پاکستان کو قبول کرو یا متحدہ ہندوستان، تو وہ بے حد غمزدہ اور پریشان ہوئے۔ قائدِ اعظم نے جب اِس بات کا ذکر راجہ صاحب سے کیا اس وقت وہ نزار و نڈھال تھے۔ وہ آرام کرسی پر ڈھیر ہو گئے، ٹھنڈی آہ بھری، سوچ میں ڈوب گئے۔ دیر کے بعد صرف اتنا کہا، کم از کم ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی جگہ تو میسّر آئی۔ ہم نے یہ سُنا تو ہم بھی نڈھال ہو کر صوفے میں

دھنس گئے۔ راجہ صاحب کو ہماری حالت پر رحم نہ آیا، اُن کے وار جاری رہے۔ فرمانے لگے کہ اگر قائدِ اعظم آج زندہ ہوتے تو وہ کچھ اور سوچتے۔ کچھ اِس برِّ عظیم کے حالات اُن پر اثر انداز ہوتے اور کچھ بیرونی دنیا کے واقعات۔ وہ کسی اور نہج پر سوچتے اور کسی اور راہ پر چلتے۔ ہمارے لیے اشارہ کافی تھا۔ ہمیں اندازہ ہونے لگا کہ راجہ صاحب ضرور کسی اور نہج پر سوچنے لگے ہیں۔ ہمیں یہ بھی اندازہ تھا کہ پچھلے بیس برس تک محض بیٹھے رہنے کی وجہ سے راجہ صاحب میں اب کسی نئی راہ پر چلنے کی سکت باقی نہیں رہی۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں راجہ صاحب نے دِل لگی میں قائدِ اعظم سے یہ پوچھا کہ اگر پاکستان نہ بن سکا تو پھر کیا ہو گا۔ قائدِ اعظم نے بقول راجہ صاحب جواب دیا کہ آسمان تو گِرنے سے رہا۔ راجہ صاحب نے کہا میں مذاق نہیں کر رہا۔ قائدِ اعظم نے فرمایا میں بھی مذاق نہیں کر رہا۔ جانتے ہو انگریزی میں دو حرف ہیں ایم اور ایل ان سے لفظ مسلم لیگ بھی بنتا ہے اور مائنارٹیز (اقلیت) لیگ بھی، ہندوؤں کی قیادت برہمن اور بنیے کے ہاتھ ہے۔ ہم سب مل کر انہیں ناک چنے چبوا دیں

گے۔ راجہ صاحب کا اشارہ واضح تھا۔ وہ بھاڑ جس میں یہ چنے بھونے جاتے ہیں اس کا ایندھن باہر سے آتا ہے۔ اب راجہ صاحب کچھ اور کھل گئے۔ مسلم لیگ نے پاکستان نہیں بنایا مسلم لیگ کہاں اتنی منظّم تھی کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکتی۔ اِس ملک کی تعمیر کے عوامل کچھ اور ہی تھے۔ ہندوؤں کا زور اور ظلم، دفاتر کے مسلم عملے کی طلب جاہ و مرتبہ اور مسلم تاجر کی حرص و ہوا۔ بات اب وہاں پہنچ چکی تھی۔ منظور الٰہی بھی وہاں موجود تھے۔ اس مرحلے پر اُن کے ضبط کا مضبوط بند ٹوٹ گیا اور انہوں نے بصد ادب اختلافِ رائے کی معافی چاہی۔ راجہ صاحب اس وقت کسی کو بخشنے کے حق میں نہ تھے۔ اختلاف کو خاطر میں نہ لائے اور مسلم لیگ کی کمزوریوں کا بیان جاری رہا۔ کہنے لگے ہم لوگ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ میں راز داری کا حلف اُٹھا کر شامل ہوتے اور جو نہی باہر آتے اُس وقت ایک شہرت پسند ممبر صحافیوں کی معرفت سارے راز ہندوؤں تک پہنچا دیتے۔ اِس سستی شہرت کے طالب کا ظرف چھوٹا اور زبان دراز تھی۔ راجہ صاحب کی زبان سے یہ بات عجیب لگی، نہ جانے اُن کا روئے سُخن کدھر تھا۔ سُننے والوں کو شُبہ

ہوا کہ اُن کا اشارہ یا تو اُن صاحب کی طرف ہے جو بڑے خلیق ہیں اور زمانہ انہیں اِس حیثیت سے جانتا ہے یا اُن بیگم صاحبہ کی طرف جنہیں اُن دِنوں بڑا اعزاز حاصل تھا۔

راجہ صاحب اب کہانی کے آخری حصّے پر پہنچ چکے تھے۔ یہ حصّہ اُن کی اپنی ذات کے بارے میں تھا۔ آواز آہستہ آہستہ اُونچی ہوتی گئی اور نہایت سخت اور درشت لہجے میں وہ بعض معاملات میں اپنی ناراضگی کا اظہار فرمانے لگے۔ میں واقفِ حال ہوں۔ کچھ کہنا چاہتا ہوں تو میرا منہ نوچ لیا جاتا ہے، مجھے معلوم ہے یہ سب کچھ کس کے اشارے پر ہوتا ہے۔ راجہ صاحب کا منہ غصّے سے تمتما اُٹھا مگر میری سمجھ میں نہ اشارہ آیا نہ کنایہ۔ بات یہاں پہنچ کر ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ڈنر بھی ختم ہو گیا۔

رات ڈھل چکی تھی، سڑک پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ایک طرف دور بندر گاہ کی روشنیاں تھیں۔ دوسری طرف بہت دور تیل کے کارخانے سے ایک شعلہ آسمان کی طرف لپک رہا تھا۔ راستے میں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی وسیع اور گول

مسجد بھی آئی۔ اُس کے نزدیک جھگیوں میں کہیں شور ہو رہا تھا اور اُن سے پرے ایک خیالی اور بُلند عمارت کا دُھندلا سا خاموش عکس نظر آرہا تھا۔ یہ قائدِ اعظم کا مزار تھا۔ میں نے اِس شہر کے بارے میں سوچنا شروع کیا جو اب مچھیروں کی بستی نہیں رہا بلکہ مملکتِ خُداداد کا سب سے بڑا شہر بن چکا ہے۔ بات شہر سے ہوتی ہوئی ملک کی تاریخ تک پہنچی۔ کیا یہ ملک بقول راجہ صاحب تاجروں اور ملازمین سرکار کی خود غرضی کی وجہ سے بنا ہے۔ میں گھر پہنچا تو میرے کانوں میں راجہ صاحب کا یہ جملہ گونج رہا تھا کہ پاکستان مسلم لیگ نے نہیں بنایا۔ اِس کے عوامل کچھ اور ہی تھے۔ میں نے اِن عوامل کی نشاندہی کے لیے دراز کھولا اور آٹو گراف البم نکالی، آج سے ستائیس برس پہلے راجہ صاحب نے دسمبر ۱۹۴۳ء میں اِس البم پر دستخط کرتے ہوئے اِن عوامل کا ذکر کیا تھا۔ راجہ صاحب نے دستخط کے ساتھ میں دو شعر لکھے تھے۔

چمن میں کونپلیں اسلام کی مُرجھائی جاتی ہیں

کہ پامال مظالم سبزۂ نوخیز ہے ساقی

بجائے بادۂ سر جوش شیشوں سے لہو اُبلے

کھنچے تیغ اب رگوں میں خوں کی گردش تیز ہے

ساقیؔ

میں نے یہ دونوں شعر کئی بار پڑھے، جی چاہا کہ ایک ساقی نامہ میں بھی لکھوں اور ساقیؔ سے آبِ بقائے دوام لانے کی فرمائش کروں۔ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ قحط الرّجال کا یہ عالم ہے کہ پرانے بادہ کش یا تو اُٹھتے جا رہے ہیں یا اِتنے بدل گئے ہیں کہ پہچانے میں نہیں آتے۔ جن لوگوں کی باتوں پر ہم بھی سر دُھنتے اور ایمان لاتے تھے اب اُن پر سر پیٹتے اور حیران رہ جاتے ہیں۔

(۱۰)

میں نے آٹوگراف البم کا ورق اُلٹا اور وہ سادہ نکل آیا۔ اگلے دو چار ورق بھی سادہ

تھے۔ اس کے بعد کچھ اور دستخط ہیں اور اُن کے بعد بہت سے ورق خالی ہیں۔ یہ البم میں نے چونتیس برس پہلے خریدی تھی اور اِسے مسلسل استعمال کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود اس کے نصف صفحات خالی ہیں۔ پچھلی تین دہائیوں میں سرکردہ افراد غول در غول ملے ہیں، انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے مگر ابھی تک یہ البم نہیں بھری، یہ ماجرا کیا ہے۔ شیخ یوسف سبریلی نے جو ابنِ عربی کے مُرشد تھے ایک سیاہ بلّی پالی ہوئی تھی۔ شیخ کی صحبت میں یہ بلی تزکیۂ باطن کی منزلیں طے کر گئی۔ وہ بے ہنر سے نفرت اور بے غرض سے اُلفت کرتی اور اُن دونوں کو شناخت کر لیتی۔ اولیا ملنے آتے تو ادب سے بیٹھی رہتی، کوئی بے ذوق آ نکلتا تو یہ اُٹھ کر چلی جاتی۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ قلب میں کچھ خاصیت و خصلت اس سیاہ بلّی کی پیدا ہو جائے۔ اس کا رنگ تو آ گیا مگر اس کی مردم شناسی نہ آئی۔ کوشش البتّہ جاری ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ میں نے جب بھی اپنی آٹو گراف البم کو استعمال کے لئے ساتھ رکھا پہلے دل میں جھانکا، اگر بلّی اُٹھ کر چلی جائے تو میں البم کو جیب سے باہر نہیں نکالتا۔

میں ابو الکلام آزاد کا معترف ہوں مگر نثر کی حد تک۔ الہلال کی جلد میں بندھی ہوئی گھر میں رکھی تھیں۔ میں ۱۹۱۱ء کا پہلا پرچہ نکالتا، پڑھتا اور سر دُھنتا۔ میں نے الہلال کو اس کے بند ہونے کے برسوں بعد پڑھا تھا اور اس میں مجھے اس قدر تازگی نظر آئی کہ میں مولانا کا قائل ہو گیا۔ سیاست کی بات البتّہ بالکل مختلف ہے۔ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر جب طلبا نے مولانا کے ساتھ گُستاخی کی تھی اُن دِنوں میں بھی طالب علم تھا اور اُس گروہ میں شامل تھا جو کمک کے طور پر اسٹیشن پہنچا تو گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ مجھے دیر تک اس موقع کے ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس رہا۔ ہم قائدِ اعظم کے مقتدی تھے۔ ہمیں امام الہند کی امامت گوارا نہ تھی۔

آزادی ملی اور فسادات شروع ہو گئے۔ پاکستان تحریک کے چھوٹے بڑے سبھی رہنما پاکستان چلے آئے۔ مولانا آزاد نے دِلی کی شاہ جہانی جامع مسجد میں ایک زور دار تقریر کی اور سارا الزام مسلم لیگ اور مسلم عوام پر رکھا۔ تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ تم میری مخالفت اور مسلم لیگ کی موافقت کرتے رہے ہو، اب اس کا مزہ

چکھو۔ کہنے لگے پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں داغِ جدائی دے گئی ہے اِس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تُم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنّتیں تازہ کر دیں۔ ان سنّتوں کو تازہ کرنے والوں میں علی گڑھ کے طلبا پیش پیش تھے مگر آزادی کے بعد مولانا سے مفاہمت کے بغیر علی گڑھ کا گزارہ کیسے ہوتا۔ مولانا کو جلسہ تقسیمِ اسناد کا مہمانِ خصوصی بنا کر بلایا گیا اور اعزازی ڈاکٹریٹ پیش کی گئی۔ طلبا میں اسناد تقسیم ہوئیں تو ایک سند اور تمغہ میرے حصّے میں بھی آیا۔ مولانا نے اُس جلسہ میں ایک خطبہ پڑھا جسے سُن کر بہت سے لوگ اداس ہو گئے۔ مولانا کے اشارے علی گڑھ تحریک کے خلاف تھے اور اُن الزامات کو ثابت کرنے کے لیے وہ تاریخ میں اُلٹے قدم بہت دُور تک چلے گئے۔ میں چند دِن کے لیے پاکستان سے آیا ہوا تھا۔ فساد، مہاجرین نہروں کا پانی، اثاثے کی تقسیم، کشمیر کا مسئلہ، سارے زخم ہرے تھے۔ ممکن ہے مولانا آزاد بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کے زخموں پر مرہم لگا رہے ہوں مگر پاکستان بسانے

والوں کے زخموں پر انہوں نے اس روز بہت نمک پاشی کی۔ مولانا اپنی دلیل کی سند تاریخ سے ملا رہے تھے۔ ہم بھی اُن کی نمک پاشیوں کی سند اُن کی تحریر سے لا سکتے ہیں۔ مولانا آزاد نے ۱۹۲۱ء میں مجلسِ خلافت کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ علی گڑھ کی قومی پالیسی یہی سمجھی جاتی ہے کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ رہیں حالانکہ مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جانا مسلمانوں کے مذہبی عمل میں شامل ہے۔ ہندوؤں کی غلامی کو مولانا اپنے علم و انشا کے زور سے عین عبادت ثابت کرتے رہے ہیں۔ جہاں تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تعلّق ہے مولانا اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اُس کے بہت بڑے مخالف بن گئے تھے۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولانا آزاد نے اتّحادِ اسلامی کے موضوع پر ایک خطبہ دیا جس میں عالمانہ طنز کے سارے حربے اور وار مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی خواہش رکھنے والے مسلمانوں کے حصّے آئے۔ فرماتے ہیں مگر اس کو کیا کیجئے کہ مسلم یونیورسٹی، ہمارے قومی مقاصد کا اصلی نصب العین، کعبۂ علی گڑھ کے شبِ زنداں دار اُن عبادت کی چہل سالہ تہجد گزاری کی مراد، آرزو اور ہمارے رہنمائے اوّل کی دی

ہوئی شریعت تعلیم کا یومِ تکمیل ہے۔ جس دِن یونیورسٹی بن جائے گی اُس دِن

ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ

ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا کی وحی اسٹریچی ہال کی میّت پر نازل ہو گی۔ جبکہ تقسیمِ اسناد کا

پنڈال یونیورسٹی کی کرکٹ گراؤنڈ میں لگا ہوا تھا۔ اسٹریچی ہال بھی نزدیک تھا۔

جلسہ ختم ہوا اور طلبا مولانا کے آٹو گراف لینے کے لیے آگے بڑھے۔ میں

خاموش اپنی جگہ کھڑا رہا۔ بلّی اُٹھ کر اسٹریچی ہال کی طرف چل دی۔

ایک مسلم رہنما جن کی خدمات مسلّم ہیں۔ بڑے انگریز دوست ہوا کرتے تھے۔

تمام عمر انگریز سے دوستی رکھی اور جوانی کے بیشتر اور کار آمد حصّے میں ان سے

رشتہ داری بھی رکھی۔ ان کو اِس بات پر ہمیشہ ناز رہا کہ اپنی طویل مجلسی زندگی

میں انہیں بکنگھم پیلس میں چار شاہی پشتوں کے ساتھ ڈنر کھانے کا اعزاز حاصل

ہوا ہے۔ اِس بات کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ انہوں نے اپنی سوانح عمری میں کیا

ہے۔ یہ چار پُشتیں ایڈورڈ ہفتم و ہشتم، جارج پنجم و ششم اور الزبتھ دوم پر مشتمل

ہیں۔ اگر خاندان شاہی کو دو چار مسز سمپسن اور میسّر آجاتیں تو عین ممکن ہے کہ

ہمارے رہنما کا سابقہ انگریز بادشاہوں کی سات پشتوں سے پڑ جاتا۔ اِن بادشاہوں سے ہمارا رابطہ بھی رہا ہے مگر وہ قصرِ بکنگھم کی دعوت سے مختلف ہے۔ ہم نے آنکھ کھولی تو ہر چوک میں ملکہ کا بُت ایستادہ تھا۔ ہم نے قائدہ کھولا تو اُس میں جارج پنجم کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ہم نے اخبار کھولا تو اُس شخص کے تذکرے سے بھرا ہوا تھا جس نے محبّت کی خاطر تخت و تاج کو ٹھکرا دیا۔ ہم نے ریڈیو کھولا تو جارج ششم رُک رُک کر تقریر کر رہے تھے کیونکہ اُن کی زبان اکثر لڑکھڑا جاتی تھی۔ جہاز کا دروازہ کھُلا تو ملکہ الزبتھ دوم باہر نکلیں۔ استقبال کرنے والوں میں مَیں بھی پیش پیش تھا۔ ملکہ نے پاکستان کا دورہ کراچی سے شروع کیا اور مُجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حیثیت سے اُس کا انتظام کرنا تھا۔ ملکہ لاہور گئیں تو مُجھے بھی لاہور میں خصوصی شاہی باکس میں بیٹھ کر گھُڑ دوڑ دیکھنے کا اتّفاق ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ایک روز مجھے ملکہ الزبتھ سے تنہا ملنے کا موقع ملا۔ میں تنہا تھا مگر ملکہ اپنے چُلبلے خاوند کے ساتھ کھڑی تھیں۔ غرض آٹوگراف لینے کے کتنے ہی موقعے آئے اور پھر چلے گئے مگر مجھے بلّی کسی موقع پر نظر نہ آئی۔ برِّعظیم کی ساری تاریخ

آنکھوں کے سامنے پھِر گئی اور میں نے آٹو گراف البم کو جیب ہی میں رہنے دیا۔ مجھے تاجِ برطانیہ کے وارث کے دستخط درکار نہ تھے۔ یہ البتّہ حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جب میں چلنے لگا اور ملکہ سے اجازت چاہی تو انہوں نے مجھے اپنی ایک تصویر تحفہ میں دی جس پر ان کے دستخط بقلم خود ثبت ہیں۔

چین گیا تو ان دِنوں وہاں نہ کوئی بادشاہ تھا نہ کوئی ملکہ، شاہی محل سونا پڑا تھا۔ بادشاہ کو ہٹائے ہوئے زیادہ دِن نہیں گزرے اور اُس کا گھر عجائب گھر بن گیا ہے۔ بادشاہ کے نام کی نوبت اب نہیں بجتی بلکہ ہر کام ڈنکے کی چوٹ پر عوام کے نام پر کیا جاتا ہے۔ میرے ساتھ یہ آٹو گراف البم بھی تھی اور یہ خیال بھی کہ اِس البم کے پہلے صفحے پر ایک چینی کے دستخط ہیں اور بیس صفحے کے بعد بھی ایک اور چینی نے دستخط کئے ہوئے ہیں۔ دونوں عالم تھے اور مسلمان، ایک کا نام ابراہیم شاکیو چن اور دوسرے کا نام محمد عثمان وُد تھا۔ ابراہیم اور عثمان کا چین اور تھا اور آج کا چین اور ہے۔ وہ چیانگ کائی شیک اور مادام چیانگ کا چین تھا۔ یہ ماؤزے تنگ اور چو این لائی کا چین ہے۔ میں نے چو این لائی کو دور و نزدیک سے

دیکھا ہے۔ پاکستان میں دُور سے اور چین میں نزدیک سے۔ وہ مُجھے اچھے انسان لگے مگر میں اُن کے کارناموں کی شہرت اور اُن کی شخصیت کی عظمت کے باوجود انہیں اپنی آٹو گراف البم نہ پیش کر سکا۔ میں حفظِ مراتب کا قائل ہوں۔ پہلے اُس نئے چین کے بانی اور معمار کے دستخط ہوں گے تو پھر دوسرے رہنماؤں کی باری آئے گی۔ یہ خیال مجھے پاکستان میں تھا اور جب میں چین گیا تو اس خیال کو بڑی تقویت ملی۔ جہاز کینٹن کے ہوائی اڈّے پر اُتر رہا تھا۔ میدان کے ایک طرف کھیتوں کے ساتھ بڑے بڑے کتبے لگے ہوئے تھے۔ یہ کیا ہے میں نے پوچھا۔ جواب ملا اقوالِ ماؤ۔ ائیر پورٹ کی عمارت کی پیشانی پر پڑھ لکھا تھا، پانی کی اُونچی ٹنکی کے گرد بھی کچھ لکھا ہوا تھا۔ ہوائی جہاز کے اندر، بس کے اندر، مکانوں اور دکانوں کے اندر، دیواروں اور دروازوں کے باہر ہر جگہ کچھ نہ کچھ لکھا ہوا تھا۔ لفظ جلّی، علیحدہ اور سُرخ تھے۔ میں نے ہر بار پُوچھا کہ یہ کیا ہے اور ہر مرتبہ ایک ہی جواب ملا۔ کلچرل انقلاب کے بعد دوبارہ گیا تو جس شخص سے مصافحہ کیا اُس کے بائیں ہاتھ میں ایک ننھی سی سُرخ کتاب نظر آئی۔ یہ کتاب ہر ایک کے پاس

تھی اور اُسے پکڑنے کا انداز بھی یکساں تھا۔ انگشتِ شہادت دُہری کیجیئے، کتابچہ اس پر رکھیے اور انگوٹھے سے دبا لیجیئے، گرفت اِتنی مضبوط ہونی چاہیے جتنی چیئرمین ماؤ کی چین اور اہلِ چین پر ہے۔ اب کی بار چیئرمین ماؤ کے مجسّمے تعداد میں زیادہ اور جسامت میں بڑے نظر آئے۔ یہاں بھی ارادے پختہ اور بلند ہو گئے۔ اب اگر دستخط حاصل کرنے ہیں تو اُس شخص کے۔ میں نے ماؤزے تنگ کے بچپن کے حالات پڑھنے شروع کئے۔ معلوم ہوا کہ تنگ شان اسکول میں اُن کا ایک عزیز پڑھتا تھا۔ اُس نے لڑکپن میں ایک کتاب ماؤ کو پڑھنے کے لئے دی جس کا نام تھا دنیا کی عظیم ہستیاں۔ اس کتاب میں نپولین، پیٹر دی گریٹ، گلیڈ سٹون، ویلنگٹن، روسو اور لنکن کا حال درج تھا۔ آج کل اس عنوان کی کوئی کتاب اُٹھالیں اُس میں ماؤزے تنگ کے نام کا اضافہ ملے گا۔

میں نے چین میں ایک اہم شخص سے موٹر میں یہ پوچھا کہ چیئرمین ماؤ کے آٹو گراف کیسے مل سکتے ہیں۔ اس شخص کی حیرت اور گھبراہٹ دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ بولا ناممکن ناممکن، باہر سڑک کے کنارے اقوالِ ماؤ کے کتبے لگے ہوئے تھے۔

میں نے چینی زبان جانے بغیر دل میں اُن کا ترجمہ یوں کیا کہ بقول چیئرمین ماؤ کوئی جائز خواہش ناممکن نہیں ہوتی۔ میرے لیے یہ صورتِ حال غیر متوقع نہ تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ جس شخص کے دستخط چین کے ہر در و دیوار اور ہر چینی کے دل و دماغ پر ثبت ہیں اُس سے یہ کہنے میں دشواری ہو گی کہ وہ ایک ننھی سی نیلی کتاب پر بھی دستخط کر دے۔ چیئرمین کے دستخط نہ مل سکے، وزیرِ اعظم کے دستخط کے لیے میں نے شرط لگا رکھی ہے۔ میری آٹو گراف البم چین کے سفر سے بخیریت مگر خالی واپس آ گئی۔ بلّی کو واپسی میں تامّل ہوا۔ وہ کچھ دِن اور چین میں گزارنا چاہتی تھی۔

کئی بڑے آدمی ملے، جن کے دستخط حاصل کرنا آسان تھا مگر مشکل پسند طبیعت کو یہ بات گوارا نہ تھی۔ شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں۔

شکار مردہ کی ذرا سی تفصیل بیان ہو جائے۔ ایک بادشاہ کے دادا غدّار تھے، ایک شہزادہ ستم گر تھا، ایک ملکہ بے راہ رو نظر آئی، ایک بڑے ملک کا جوان صدر عربوں کے خلاف تھا، ایک عرب صدرِ پاکستان کے حق میں نہ تھا، ایک وزیرِ

اعظم انگریزوں کے ایجنٹ تھے، دوسرے کو لوگ سی آئی اے کا ایجنٹ کہتے ہیں۔ ایک مسلمان صدر دل کو بہت بھائے، میں نے سوچا اِن کے دستخط لوں گا۔ دوسرے دِن جب کان میں بھنک پڑی کہ اُن کی رات کیسے گئی ہے تو میں نے ارادہ بدل لیا۔ میں نے اِن دستخطوں کے سلسلے میں اپنا ارادہ دو مرتبہ اور بدلا ہے۔ ایک بار مارشل ٹیٹو صدر یوگوسلاویہ کے بارے میں اور ایک بار او تھانٹ سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کے بارے میں۔

مارشل ٹیٹو جب لاہور آئے تو اُن کے پروگرام میں شاہی مسجد اور اقبال کے مزار پر حاضری بھی شامل تھی۔ اُن کے بارے میں یہ رائے قائم کی گئی کہ وہ عبادت گاہ اور مزار دونوں سے دوری تو درکنار کچھ اصولی بیزاری رکھتے ہوں گے لہٰذا انہیں سرسری طور پر یہ دونوں عمارتیں دِکھا دی جائیں۔ مارشل ٹیٹو کی موٹر سیڑھیوں کے پاس رُکی۔ وہ آہستہ آہستہ اُوپر چڑھے، وہ سر جھکائے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ صدر دروازے پر پہنچے تو وہاں انتظام کرنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ٹیٹو اس انہماک سے باتیں کر رہے تھے کہ انہوں نے تو شاہی مسجد کے

خوبصورت صدر دروازے کی عمارت پر نظر کی اور نہ اس دروازے سے مسجد کی جھلک دیکھی۔ خدّام غلافِ کفش لے کر اُن کی طرف بڑھے اور ٹیٹو کی توجّہ اُس انوکھی شے کی طرف ہو گئی۔ جب غلاف جوتے پر چڑھ گیا تو سنبھل سنبھل کر چلنے لگے اور اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگے کہ اُس پر کیا گزرتی ہے۔ وہ خاتون اُن سے کہیں زیادہ پُر اعتماد قدموں سے چل رہی تھی۔ اُدھر سے اطمینان ہوا تو پہلی بار ٹیٹو نے سر اُٹھایا اور مسجد کی عمارت کو دیکھا۔ وہ اس وقت صدر دروازے کو طے کر کے صحن میں داخل ہوئے تھے۔ مارشل ٹیٹو کے چہرے کا رنگ یکایک بدل گیا۔ کسی نے اُن کے پاؤں فرش کے ساتھ جکڑ دیے اور عینک کے شیشوں کے پیچھے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دیر تک وہ پلکیں نہ جھپک سکے۔ میں نے اُن کے چہرے پر تاثر کے تین رنگ دیکھے، حیرت، ہیبت اور حسن زدگی۔ وہ صحن کی آخری صف میں کھڑے ہو کر عمارت کو اتنی دیر تک دیکھتے رہے کہ اُن کے پروگرام کے اوقات میں تبدیلی کرنی پڑی۔ مارشل ٹیٹو نے جب دم لیا تو کچھ بیوی سے کہا جس نے جواب میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد صدر یوگوسلاویہ نے کیمرہ

مانگا، دیر تک زاویے بناتے رہے، پھر کیمرہ لوٹا دیا اور کہا سب سے کشادہ زاویے والا کیمرہ چاہیے۔ ایک اور کیمرہ پیش ہوا اور وہ دیر تک تصویریں کھینچتے رہے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ یہ عمارت ساڑھے تین سو سال پرانی ہے اور اب بھی عیدین پر بھر جاتی ہے تو وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ کچھ سوچ مجھے بھی آئی۔ میں نے یوگوسلاویہ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ۹۷۰ھ کی بنی ہوئی ایک مسجد دیکھی تھی، یہ مسجد اب صرف دیکھنے کے کام آتی ہے۔ اس قصبے کا نام پوچی طے ہے۔ مگر مجھے اس نام کے ساتھ کچھ اور نام یاد آرہے ہیں۔ اس مسجد کے پاس مجھے تین بچے ملے تھے۔ میں نے اشارے سے ان کا نام پوچھا۔ جواب ملا کمال، قدیرہ اور مائدہ۔ مجھے حیرت آمیز مسرّت ہوئی کہ یوگوسلاویہ کے ایک دُور افتادہ دیہاتی علاقے میں ایک مقفّل مسجد کے زیر سایہ رہنے والے اب بھی اپنے بچوں کے نام قرآن مجید کی پانچویں سورت پر رکھتے ہیں۔ میں نے پوچی طے کی مسجد میں اپنی مسرّت اور شاہی مسجد لاہور میں صدر یوگوسلاویہ کی حیرت کی مشترکہ یادگار کے طور پر مارشل ٹیٹو کے دستخط حاصل کر لیے۔

او تھانٹ کی بات ذرا مختلف ہے۔ وہ لاہور آئے، ان کا استقبال کرنے والوں میں مَیں بھی شامل تھا۔ انہوں نے ائیر پورٹ کے وی آئی پی روم میں کچھ دیر توقّف کیا۔ اخباری نمائندے یہاں موجود تھے۔ وہ سوال پوچھتے رہے او تھانٹ ٹالتے رہے، میں دیکھتا اور سنتا رہا۔ آپ کی اِس مسئلہ پر کیا رائے ہے۔ یہ اہم مسئلہ ہے۔ آپ کی اس مسئلہ پر کیا رائے ہے۔ وہ بھی اہم مسئلہ ہے۔ آپ کانگو کی جنگ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اسے بند ہونا چاہئے۔ آپ ویت نام کی جنگ کے بارے میں بھی یہی کہنا چاہتے ہیں۔ جی ہاں کشمیر کا حل کیا ہے۔ یہ مسئلہ اقوامِ متحدہ کے زیرِ غور ہے۔ آپ کی پالیسی کیا ہے۔ دنیا میں پائدار امن۔ یہ انٹرویو مایوس کُن تھا۔ بے معنی جملے جو بے ایمانی سے قریب اور حقیقت سے دور ہوتے ہیں۔ بے وزن باتیں جنہیں سفارتی آداب کہتے ہیں۔ بے وجہ چشم پوشی اور جان بوجھ کر پہلو تہی۔ ناحق اس عہدہ دار کو دنیا کا غیر رسمی وزیرِ اعظم کہتے ہیں۔ یہ شخص تو دنیا بھر سے خائف رہتا ہے اور ہماری طرح سیدھی سادی بات بھی نہیں کر سکتا۔ آٹو گراف البم جیب ہی میں پڑی رہی اور دوسرے دِن اُن کا جہاز واپس

چلا گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی اور ایک مدّت گزر گئی۔ میں جاپان کے شہر ناگویا میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے انگریزی اخبار اور رسالہ خریدا تاکہ منہ کا ذائقہ بدلوں۔ جاپانی آوازیں سُنتے سُنتے اور جاپانی تحریر میں دیکھتے دیکھتے تھک گیا تھا۔ جو زبان نہ آتی ہو اُس کے قریب جائیں تو فوراً تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ میں نے انگریزی رسالہ کھولا اس میں او تھانٹ کی تصویر تھی، وہ برما گئے اور وہاں اپنی والدہ سے ملے۔ یہ تصویر اس ملاقات سے متعلّق تھی۔ تصویر میں ایک دُبلی سی بڑھیا اُونچی کرسی پر ننگے پاؤں بیٹھی ہے۔ معمولی لباس اور اُس پر بہت سی شکنیں، سادہ سی صورت اور اس پر بہت سی جھُریاں۔ چہرہ البتّہ مسرّت سے دمک رہا تھا۔ اس کے قدموں میں او تھانٹ ایک نفیس سوٹ پہنے زمین پر سجدے میں پڑا ہوا تھا۔ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد میں سیکرٹری جنرل اقوامِ متحدہ کی بے مزہ پریس کانفرنس کو بھول چکا ہوں اور اب ایک سعادت مند بیٹے کی تلاش میں ہوں تاکہ وہ میری آٹو گراف البم میں اپنے دستخط کر دے۔

میں نے بہت سی آٹو گراف البمیں دیکھی ہیں، دوستوں اور غیروں کی، بچّوں

اور بڑوں کی، درسگاہ میں جب کوئی معزّز مہمان آیا تو ہر ایک آٹو گراف البم تھامے نظر آتا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس میں کوئی بڑا آدمی ٹھہرا ہو تو وہاں ملٹری سیکرٹری کے کمرے میں البموں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ اُن بہت سی البموں میں جو مَیں نے دیکھی ہیں ایک البم ایسی ہے جو آنکھوں کے سامنے گھومتی رہتی ہے۔ یہ البم مجھے دی گئی تاکہ میں اُس پر اپنے دستخط کر دوں۔

البم پیش کرنے والی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ وہ ایک بدنام گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور خود بھی کوئی ایسی نیک نام نہ تھی۔ اس کا شوق دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کیا وہ واقعی اس مشغلے میں دلچسپی لیتی ہے یا یہ کتاب پہلے تعارف کا ذریعہ اور اس کے بعد تعلقات کی سند بن جاتی ہے لوگوں نے اس البم میں کیا کچھ لکھا ہو گا۔ میں نے دل میں سوچا۔ اس کے پہلے صفحے پر حدیث ہو گی، دوسرے صفحے پر ایک بزرگ کا قصّہ ہو گا اور تیسرے صفحے پر خیام کی رباعی ہو گی۔

حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک بدکار عورت نے اوڑھنی سے موزہ باندھ کر کنوئیں سے پانی نکالا اور ایک پیاسا کتّا جو

وہاں زبان نکالے کھڑا تھا، اُسے پلایا۔ پس وہ عورت بسبب اِس کام کے بخشی گئی۔ انسان کی بھوک بھڑکائی تو سنگسار ٹھہری، حیوان کی پیاس بجھائی تو مغفرت مل گئی۔ یہ قدرت کی میزان ہے۔

ایک بزرگ نے طوائف کے اصرار پر اُسے اپنے گھر بلایا، کہنے لگے وضو کر کے نماز پڑھ لو اس کے بعد تمہاری فرمائش جو تم میری آزمائش کے لیے کر رہی ہو پوری کر دوں گا۔ وہ نماز کے لیے کھڑی ہوئی اور یہ سجدے میں گر گئے۔ خدایا میں اِسے تجھ تک لے آیا ہوں، میرا کام ختم ہو گیا، اب یہ تیرا کام ہے کہ اِسے اپنا لے یا رد کر دے۔ دُعا قبول ہوئی، عورت اپنائی گئی، مرد محفوظ رہا، یہ بھی اصلاح کا ایک نسخہ ہے مگر ہر معالج اسے تجویز کرنے کی جرأت نہیں رکھتا۔ خیام کی رباعی جو اِس وقت یاد آئی تھی:

شخصے بزنے فاحشہ گفتا مستی

ہر لحظہ بدام دیگرے پیوستی

گفتا شیخا ہر آنچہ گوئی ہستم

امّا تو چنانچہ می نمائی ہستی

یہ تینوں چیزیں تو اس کتاب میں لکھی ہوں گی۔ مجھے کیا لکھنا چاہیے۔ میں نے قلم کھولا اور میز پر البم کھلی پڑی تھی اور سامنے ایک کھلا دعوت نامہ تھا میں نے لکھا، فتوحات ان کے حصّے آتی ہیں جو شکست نا آشنا ہوں۔ وہ پڑھ کر مُسکرائی، نہ جانے وہ اِس کا مطلب کیا سمجھی، میں نے ہاری ہوئی زندگی کو یہی نصیحت مناسب سمجھی اور البم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ دستخط، عہدے، مقولے، عشقیہ شعر، محبّت آمیز خطاب، یادوں کے حوالے، سبھی کچھ اُس کے صفحات پر بھرا ہوا تھا۔ اور مناسب معلوم ہوتا تھا۔ یکایک میری نظر ایک افسر کے دستخطوں پر پڑی۔ خوش خط اور سادہ دل محترم نے محترمہ کے نام اپنے پیغام میں لکھا تھا، آؤبی بی ہم سب مل کر اسلام کا نام روشن کریں۔ میں نے سر اُٹھا کر اس نوجوان لڑکی کو دیکھا۔ دوپٹہ ندارد، قمیض کی آستین ندارد، آنکھوں میں حیا ندارد، بال کھلے، گریبان کھلا، فقرے اور لباس چُست۔ یہ انداز خدمت اسلام کے نہیں، خدمتِ خلق

کے ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں میرے دوست کی تحریر کا اس پر کیا اثر ہوا۔ اس کے شب و روز بدل گئے یا وہ اپنی آٹو گراف البم کی طرح گردش میں رہی اور لوگ اُس پر اپنے دستخط ثبت کرتے رہے۔

صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

(۱۱)

کعبۂ دِل میں ایک روز جھانکا تو دیکھا کہ ایک صنم نے وہاں گھر کر لیا ہے۔ ہمیں گمان تھا کہ دورِ آذری ختم ہوئے مدّت بیت چکی ہے اور اس عرصہ میں دِل اگر صحنِ مسجد نہیں بن سکا تو کیا غم کم از کم بُت کدہ تو نہیں رہا۔ اب جو یہ گمان غلط نکلا تو اپنے ہی بارے میں لاعلمی پر تشویش ہوئی۔ یہ کس کا بُت ہے جو اب تک سلامت ہے اور نہاں خانۂ دِل میں کیسے آن چھپا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر نظر ڈالی تو یہ بہت ایک دیوی کا نکلا۔ دُبلی پتلی، بوٹا قد، تنگ دہن، آنکھیں کشادہ اور روشن بالوں میں کنگھر ہیں اور چھوٹا سا جوڑا گردن پر ڈھلکا ہوا ہے۔ جوڑے میں جڑاؤ

پھول ہیں اور گلے میں موتیوں کا ہار۔ بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں بڑی سی انگوٹھی ہے، ساڑھی کا پلّو کاندھے پر کلپ سے بندھا ہوا ہے۔ صورت من موہنی، پہلی نظر میں پُر اثر، دوسری میں پُر اسرار۔ میں نے بھی جب اُس بُت کو دوسری بار نظر بھر کر دیکھا تو صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ ایک بھاری سانولی اور معمّر عورت نے سِلک کی سلیٹی ساڑھی باندھی ہے۔ پلّو سر پر ہے اور نصف چہرہ بھی اُس میں چھپا ہوا ہے۔ اُس نے دائیں ہاتھ سے ایک خوشنما قوس بنائی اور اسے ابرو کے سامنے لا کر سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے اراکین کو جو وکٹوریہ گیٹ میں صف بستہ کھڑے تھے یوں آداب کیا گویا وہ مسلم تمدّن کا مرقّع ہے یا شائستگی کا مجسّمہ۔ آداب کرتے ہوئے ساڑھی کا پلّو چہرے سے ڈھلک گیا تو ہم نے پہچانا کہ یہ سروجنی نائیڈو ہے۔

نوجوان مسلمانوں کی ایسوسی ایشن کے نام سے مدارس میں ایک انجمن ہوا کرتی تھی، اس انجمن میں تقریر کرتے ہوئے سروجنی نے ۱۹۱۷ء میں کہا تھا کہ جب میں کسی نئے شہر میں جاتی ہوں تو ہمیشہ اس خصوصی استقبال کی منتظر رہتی ہوں جو

مُجھے وہاں کے مسلمانوں سے میسّر آتا ہے۔ اس سلسلے میں نہ کبھی مجھے مایوسی ہوئی اور نہ کبھی میری حق تلفی ہوئی، اب جو سروجنی ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ آئیں تو ہم نے دیدہ و دِل فرشِ راہ کر دیے۔ یونیورسٹی سے وکٹوریہ گیٹ تک اُن کی موٹر کو طلبا کے گھڑ سوار دستے کی جلو میں لایا گیا۔ معزّز مہمان کی موٹر آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور گھوڑے شاہگام چل رہے تھے۔ سوار زین سے لگے بیٹھے تھے۔ ان کی وردی بڑی خوشنما تھی، گہرے سبز رنگ کے ٹرکش کوٹ، سبز پگڑی، سنہری کلاہ، سنہری جھالر، سفید برجس، سفید دستانے، سیاہ جوتے اور پنڈلیوں پر اُسی رنگ کی گرم پٹّیاں، دوش اور کمر میں چمڑے کی پیٹی جس کے ساتھ تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ سروجنی وکٹوریا گیٹ پر اُتر گئیں اور سوار مسجد کے پاس جا اُترے۔ تھوڑی دیر بعد جلوس شعبۂ تاریخ کی عمارت سے اسٹرپچی ہال کی طرف روانہ ہوا۔ سُرخ بانات بچھی ہوئی تھی۔ دستے کے دو لڑکے آگے آگے چل رہے تھے، اُن کے بعد سروجنی اور نوّاب اسماعیل تھے۔ باقی دستہ دو دو کی صف بنائے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ دستے کی سج دھج خوب تھی، سر اُٹھائے، سینہ پھُلائے، قدم ملائے اور آب

دار تلواریں بے نیام کیے ہوئے ہیں۔ میں اور گارڈ اِس دستے کی اُس صف میں تھے جو مہمانِ خصوصی اور وائس چانسلر کے بالکل پیچھے تھی۔ گارڈ ایم اے اقتصادیات میں میرے ہم سبق اور گھڑ سوار دستے میں میرے ہم رکاب تھے۔ اب وہ ایک بنک چلاتے ہیں مگر گھوڑا چلانے کا شوق بر قرار ہے۔ آج بھی اُن کے اصطبل میں دو گھوڑے بندھے ہیں اور اُن کی تنخواہ اور فرصت کا بیشتر حصّہ اُن کی دیکھ بھال میں صرف ہو جاتا ہے۔ وہ چمکار کر گھوڑے پر چڑھتے ہیں، سواری کے دوران اُس سے گفتگو بھی کرتے رہتے ہیں۔ جب تھپتھپا کر اُترتے ہیں تو تولیے سے اُس کی گردن کا پسینہ خشک کرتے ہیں اور جیب سے گُڑ کی ڈلی نکال کر گھوڑے کے سامنے کر دیتے ہیں۔ ہم دونوں نے اِن دِنوں بھی ایک دو بار اِسی طرح اکھٹّے سواری کی ہے جیسے ہم بیس برس پہلے کیا کرتے تھے۔ راستے میں وہ پوچھتے ہیں، تُم نے بھی تو گھوڑا رکھا ہو گا۔ میں جواب دیتا ہوں کہ ان دِنوں میرے اصطبل کی خبر نہ پوچھو، بس اس کی خیر مانگتے رہو۔ اور وہاں جو سلوک تم اپنے گھوڑوں سے کرتے ہو وہ تو انسانوں کو بھی میسّر نہیں۔ صُبح یونیورسٹی کی

طرف سے اسٹریچی ہال میں جلسہ تھا اور سہ پہر کو طلبا کی طرف سے یونین ہال میں، اسٹریچی ہال میں تِل دھرنے کی جگہ تھی۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا سال بھر پہلے اِس بات کا تصوّر بھی ناممکن تھا کہ مسلم یونیورسٹی میں کسی کانگرسی ہندو لیڈر کو خوش آمدید کہا جا سکتا ہے۔ چند ہی ماہ میں نقشہ بالکل بدل گیا۔ برٹش انڈیا کی جگہ دو آزاد ملک وجود میں آ گئے اور مسلم یونیورسٹی جس ملک کے قیام کے لیے کوشاں تھی اُس کی سرحدوں سے بہت دُور دوسرے ملک میں رہ گئی۔ آزادی بڑی کافر صورت اور جان لیوا نکلی۔ بس غدر مچ گیا۔ سر کٹ گئے اور سامان لُٹ گیا لہٰذا لوگ بے سر و سامان ہو گئے۔ مرنے والوں کو کسی نے دفن نہ کیا مگر بچ رہنے والے زندہ در گور ہو گئے۔ ہر شہر اور قریہ میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا مگر مسلم یونیورسٹی ابھی تک محفوظ تھی۔ پھر بُری بُری خبریں آنے لگیں۔ یونیورسٹی پر حملے کی تیّاری ہو رہی ہے، قرب و جوار کے دیہات میں باقاعدہ تربیت دی جا رہی ہے، حملہ سخت اور کئی سمت سے ہو گا۔ اُدھر یہ طے ہوا کہ حملے کی صورت میں عورتیں اور بچّے سر سیّد ہال کی کشادہ اور محفوظ عمارت میں محصور

ہو جائیں گے اور نوجوان باہر نکل کر مقابلہ کریں گے۔ کچھ ایسے انتظامات بھی کئے گئے کہ حملے کی اطلاع اگر ممکن ہو تو پہلے ہی مل جائے۔ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ حملے کی صورت میں یونیورسٹی کا سائرن بجایا جائے گا تا کہ فوری طور پر ہر ایک کو خبر ہو جائے۔ صُبح شام مقرّرہ وقت پر بجنا اس کا معمول تھا مگر وہ ایک بار جب سائرن کو نا وقت بجایا گیا تو وہ راتیں جو یونہی بے آرام تھیں، لوگوں نے آنکھوں میں کاٹ دیں۔ ایک ایک رات بھاری تھی ایک ایک دِن کٹھن تھا۔ بے چینی ضرور تھی مگر بے یقینی بالکل نہ تھی۔ ہر شخص اس حقیقت سے واقف تھا کہ ایک منزل سر ہو چکی ہے اور اب کتنے ہی بے گناہ سر اِس کی پاداش میں کٹ جائیں گے۔ تعجّب صرف اس بات پر تھا کہ یہ قربانی اُس وقت طلب ہوئی جب ہم منزل پر پہنچ چکے تھے۔ خیال تھا کہ رستہ کٹ گیا تو پاپ بھی کٹ جائے گا۔ مگر منزل شاد باد پر مہاجروں کا میلا لگا ہوا تھا اور منزلِ برباد پر مرگِ انبوہ کا جشن بپا تھا۔ ایسے جشن اور میلے کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔ نہ جوانی اور بزرگی کا، نہ کم سِنی اور نسوانیت کا، یہ وقت اور مقام کے پابند بھی نہیں ہوتے، نہ کسی کی مجبوری دیکھتے

ہیں اور نہ کسی کی فریاد سُنتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے اور خون کے لیے ناطاقتی ہی نشیب کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن جسے اللہ رکھے وہ اِس ابتلا سے بھی بچ نکلتا ہے چنانچہ مسلم یونیورسٹی بالکل محفوظ رہی۔ اس کی حفاظت کے سامان پیدا ہو گئے اور اسے نئے پاسبان میسّر آ گئے۔ اِن پاسبانوں میں سرِ فہرست سروجنی نائیڈو کا نام آتا ہے۔

سروجنی جب اسٹریچی ہال میں تقریر کے لیے کھڑی ہوئیں تو لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی حفاظت کا رسمی اور مشروط اعلان کریں گی۔ سروجنی کے دو چار معترف اس فکر میں تھے کہ نصف صدی تک اسلامی تمدّن کا دم بھرنے اور اسلام سے عشق کا دعویٰ کرنے والی آج کیونکر مسلم یونیورسٹی کی توقعات پر پوری اُتر سکے گی۔ سروجنی کے ساتھ گاندھی کیپ پہنے کچھ ہندو بھی آئے تھے جو پہلی صف میں بیٹھے تھے۔ ہر گاندھی ٹوپی سروجنی کو چتاؤنی دے رہی تھی کہ مسلمان حریف ہیں اور اِن سے برتاؤ بھی حریفانہ ہونا چاہیئے۔ سروجنی نے تقریر شروع کی اور اُن کے پہلے فقرے پر ہی سب لوگ چونک اُٹھے۔ پہلی بات پوری ہوئی تو ہم

لوگ دنگ رہ گئے اور سروجنی کے ساتھ آنے والوں پر سکتہ طاری ہو گیا کہنے لگیں، میں آج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کئی لوگوں کے مشورے کے خلاف اور چند لوگوں کی دھمکی کے باوجود حاضر ہوئی ہوں۔ مجھے علی گڑھ کی ضلعی اور یو پی کی صوبائی کانگریس نے پہلے مشورہ اور پھر حکم دیا کہ تم مسلم یونیورسٹی کا دورہ منسوخ کر دو۔ انہیں یہ بات بھول گئی کہ گورنر کی حیثیت سے میں اب کانگریس کی ممبر نہیں رہی لہٰذا نہ اُن کی رائے کی پابند ہوں نہ اُن کے ضابطے سے مجبور اور میں کسی کی دھمکیوں کو کب خاطر میں لاتی ہوں۔ میں حاضر ہو گئی ہوں بُلبُل کو چمن میں جانے سے بھلا کون روک سکتا ہے۔ ہم نے بُلبُلِ ہند کی یہ بات سُنی تو خدا کا شکر بجالائے۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

تحریکِ پاکستان سے وابستگی کی خوبی اور بھارت کی وطنیت کی خرابی کے درمیان صرف ۱۵ اگست کا ایک دِن تھا۔ اس کے بعد وحشت کا ایک دَور آیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دَور کے ختم ہونے کے ساتھ علی گڑھ بھی ختم ہو جائے گا۔ دس

طویل مہینوں کے بعد سروجنی کی تقریر ہوئی۔ بے اعتباری کی فضا چھٹ گئی۔ علی گڑھ کو اُس کا نیا مقام مل گیا۔ اب میں سر سیّد کے علاوہ سروجنی کا علی گڑھ ہو جائے گا۔ یہ تو دریا کی مانند ہے، بلند چوٹیوں سے چلا اور خشک صحرا کو سیراب کرتا ہوا سمندر کی جانب رواں ہے۔ بالآخر یہ بحرِ ہند میں جا گرے گا اور اِس کا صاف اور میٹھا پانی اپنے سے کہیں بڑے سمندری ذخیرے میں مل کر میلا اور کھارا ہو جائے گا۔

اسٹریچی ہال کے جلسے میں استقبالیہ پروفیسر ہادی حسن کو پیش کرنا تھا۔ پروفیسر صاحب خاص طور پر اس تقریر کے لیے منتخب کئے گئے تھے کیونکہ وہ اساتذہ میں انگریزی زبان کے سب سے اچھے مقرّر تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ برصغیر کی تمام درس گاہوں کے اساتذہ میں بھی اس نہج کا کوئی اور مقرّر نہ تھا۔ گورے چٹّے، دُبلے پتلے، سیاہ اچکن اور سمور کی ٹوپی، ریشمی ڈوری سے بندھا ہوا عینک کا شیشہ، سراپا نزاکت، سراسر نفاست۔ شخصیت کے سحر کے ساتھ وہ آواز کا جادُو جگاتے تھے۔ ان کی آواز مترنّم، صاف اور بُلند تھی اور اس کے زیر و بم پر انہیں غیر

معمولی قدرت حاصل تھی۔ اُن کی تقریر کے چار عناصر تھے۔ روانی، مبالغہ، تکرار اور مزاح۔ اور اس کی ادائیگی کے دو اصول تھے۔ کچھ انداز مدرسی کا اور بہت کچھ تھیٹر کی اداکاری کا۔ تقریر میں مبالغہ اسی قدر تھا جتنا فارسی قصائد میں ملتا ہے۔ وہ اُسی زبان کے صدر شعبہ تھے۔ طبیعت پر اس کا اثر لازم تھا۔ ان کے یہاں جو بلا کی روانی تھی وہ اُن کے حافظے کا کرشمہ تھا۔ سٹیج پر کھڑے ہو کر شکنتلا کا ڈرامہ تنہا دکھاتے،۔ تین گھنٹے تک اِس ڈرامے کے سارے مکالمے بناتے ہوئے وہ نہ تھکتے اور نہ اٹکتے تھے۔ سُنا ہے کہ جب وہ انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے تو نوٹس بورڈ سے بچ کر چلتے تھے کہ مبادا اُس پر نظر پڑ جائے اور کالج کے تمام اعلانات خواہ مخواہ حفظ ہو جائیں۔ والدِ محترم ایک بار اُن کے ہم سفر تھے اور ساری رات ریل گاڑی میں سو نہ سکے کیونکہ اوپر والی برتھ پر پروفیسر ہادی حسن کسی طویل تقریر کا ریہرسل کر رہے تھے۔ ذہانت اور محنت کے اس امتزاج کی وجہ سے ہادی حسن کی ہر تقریر لاجواب ہوا کرتی تھی اور اس کا اثر اور لطف بہت دیر تک قائم رہتا۔ خیال تھا کہ سروجنی کے سامنے یہ علی گڑھ کی ترجمانی کا حق بخوبی ادا کر

سکیں گے اور وہ شہرہ آفاق مقرّرہ اُن کی تقریر سے محفوظ ہو گی۔

اسٹریچی ہال میں پروفیسر ہادی حسن کی تقریر بہت اچھی ہونے کے باوجود توقّع سے کم تر نکلی۔ ان کی انگریزی تقریر اِس جلسے کی سطح سے بُلند نہ ہو سکی کہ بُلبُلِ ہند کو چمنستانِ علی گڑھ میں جس گلاب کی کشش کھینچ لائی ہے اُسے نوّاب اسماعیل کہتے ہیں۔ نوّاب اسماعیل ہمارے وائس چانسلر تھے اور ان کے ذاتی اثر ورسوخ کو سروجنی کے دورے میں بڑا دخل تھا۔ پروفیسر صاحب نے جس رعایتِ لفظی سے کام لیا وہ سروجنی کے لیے فرسودہ تھی کیونکہ وہ پچاس برس سے بُلبُلِ ہند کہلاتی اور اپنے ہر استقبال پر گُل و بُلبُل کے افسانے سُنا کرتی تھی۔ ممکن ہے ہادی حسن پر سروجنی کا جادُو چل گیا ہو۔ وہ سحر بیان بھی تھی اور عظیم الشّان بھی۔ اس کا مرتبہ اونچا اور شہرہ بُلند تھا۔ اُس کی آواز ملک کے ہر گوشے میں اور اُس کا آوازہ دور دور تک پہنچ چکا تھا۔ پروفیسر ہادی حسن اتنے سرد و گرم زمانہ چشیدہ تھے کہ سحر زدگی محض تہمت معلوم ہوتی ہے۔ اب غور کرتا ہوں تو بات کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ آزادی سے پہلے بارہا خیال آیا کہ اگر مسلم لیگ کو پروفیسر ہادی حسن کی

زبان مل جائے تو پاکستان کو کس قدر تقویت پہنچے گی۔ پروفیسر صاحب نے مسلم لیگ کے حق میں تھے اور نہ مخالف مگر زمانہ ایسا نازک تھا کہ جو غیر متعلّق ہو وہ بھی غیر ہی نظر آتا تھا۔ جدوجہد کا وہ دور گزر گیا۔ پاکستان بن گیا اور علی گڑھ میں ایک ہندو سیاسی شخصیت کے استقبال کا مرحلہ آن پہنچا۔ اب جو پروفیسر ہادی حسن کو سُنا تو اندازہ ہوا کہ وہ سیاسی موضوع پر تقریر کرتے ہیں تو بات ہی نہیں بنتی۔ ان کا مزاج اپنی نفاست اور علمیت کی وجہ سے سیاست کی طرف نہیں جاتا اور جب وہ کوشش بھی کرتے ہیں تو ناکام آورد کی کیفیّت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک الگ تھلگ اور اپنی ذات ہی سے آباد، آرام دہ مختصر اور کسی قدر تنہا زندگی میں اِس محتاج ہجوم کو داخل ہی نہیں کرتے جنہیں جانے اور سمجھے بغیر سیاسی شعور اور جنہیں چاہے بغیر سیاسی بصیرت ناممکن ہے۔

سہ پہر کو طلبا کے یونین ہال میں سروجنی کے اعزاز میں جلسہ تھا۔ میں نے اِس جلسے میں شرکت کی تو احساس کی شدّت اور جذبات کی فراوانی کا عالم تھا۔ یہ جلسہ یونین ہال میں میرے طالبِ علمی کے دور کا آخری جلسہ ہو گا۔ اس کے چند دِن

بعد ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ والدِ محترم نے اپنی جوانی کے بیس برس
جنہیں وہ حاصلِ عُمر کہتے ہیں اس درس گاہ کی خدمت میں صرف کیے ہیں۔
حالات روز بروز خراب ہو رہے ہیں۔ عزیز و اقارب لکھ رہے ہیں کہ جلد واپس آ
جایئے۔ ابّا جان کو تامّل ہے۔ بیس برس کی یاد پاؤں پڑ گئی اور ایک اصول آڑے آ
گیا۔ وہ جواب میں لکھتے ہیں۔

کہن شاخے کہ زیرِ سایۂ اوپر بر آوردی!

چوں برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

میں یونین ہال میں پہلی بار تیسری جماعت کے بچے کی حیثیت سے والدہ محترمہ
کے ساتھ داخل ہوا اور خواتین کی گیلری میں چِق کے پیچھے بیٹھا۔ وہ ۱۹۳۵ء کی
بات تھی۔ آج ۱۹۴۸ء ہے اور میں ایم اے کا امتحان دے چکا ہوں۔ وہ یونین ہال
میں میرا پہلا جلسہ تھا اور آج طالبِ علم کی حیثیت سے آخری بار شامل ہو رہا
ہوں۔ اس روز کسی کی بات میری سمجھ میں نہ آئی اور آج میں لوگوں کو اپنی بات

سمجھانے آیا ہوں۔ بھیڑ اُس روز بھی تھی مگر والدہ محترمہ ہال میں بیٹھی تھیں۔ بھیڑ آج بھی ہے اور والدِ محترم ہال کے باہر لان میں ٹہل رہے ہیں۔ اُس پہلے جلسے کی طرح اِس آخری جلسے کی مہمانِ خصوصی بھی ایک عورت ہے۔ دونوں میں خوبیاں یکساں ہیں۔ صنف کی رعایت سے نازک اور صفت کی نسبت سے سخت کوش اور سخت جان۔ وہ خاتون بھی انقلاب اور حریت پسند تھی اور یہ بھی۔ وہ تحریر میں منفرد یہ تقریر میں یکتا۔ وہ کوہ قاف کی پری یہ گُلشنِ ہند کی بُلبُل۔ اس کا نام خالدہ ادیب خانم تھا اور اِس کا نام سروجنی نائیڈو ہے۔ ان دوناموں کے درمیان بزم آرائی کی جو مسافت ہے وہ میں نے مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین ہال میں طے کی تھی۔ آج جلسہ شروع ہوا تو ہمارے یہاں کوئی مجازؔ نہ تھا جو نذر خالدہ کی طرح ایک نظم نذر سروجنی کے عنوان سے لکھتا اور لہک لہک کر سُناتا، لیکن مجازؔ کی نظم کے کتنے ہی ایسے شعر تھے جو سروجنی پر بھی صادق آتے ہیں۔ مجاز نے خالدہ ادیب خانم کے نطقِ گوہر بار اور فطرتِ احرار کا ذکر کیا، آزادی کے راز پوچھے، بیداری کا ساز چھیڑنے کی فرمائش کی۔ اس کی باتوں میں کوثر تسنیم

کا خمار دریافت کیا۔

خوبیوں کا ذکر اتنا بڑھا کہ بُلبُل خوش نوا کو بھی رشک آنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ نظم آج بھی اِسی طرح تازہ اور حسبِ حال ہے جتنی اُس موقع پر تھی جب کہ دیکھی گئی۔ یہی نہیں کہ مجازؔ نے جو کچھ خالدہ کے بارے میں کہا وہ چودہ برس بعد سروجنی پر بھی حرف بحرف پورا اترا بلکہ اُس نے اپنے بارے میں بھی اِس موقع پر جو کچھ کہا میں نے یہ جانا کہ گویا وہ میرے دل میں بھی ہے۔

پھر اِدھر آئے نہ آئے یہ شمیم جانفزا

پھر میسّر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا

چھیڑ اس انداز سے اے مطربِ رنگیں نوا

ٹوٹ جائے آج اِک اِک تار تیرے ساز کا

ذکر جس کا زہرہ و پرویں کے کاشانے میں ہے

وہ صنم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے

یونیورسٹی کے طلبا کی طرف سے خیر مقدم کے لیے ایک لڑکے کا نام پکارا گیا۔ یہ دُبلا پتلا لڑکا بھیڑ چیرتا ہوا صدرِ جلسہ کے سامنے رکھی ہوئی میز کے اُس کنارے پر جا کھڑا ہوا جہاں مائیکروفون رکھا تھا۔ وہ صدر اور سروجنی کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس نے ہال کی طرف دیکھا تو آواز آئی، ٹوپی، ٹوپی۔ کسی نے ایک جناح کیمپ بڑھائی اور اُس لڑکے کے سیاہ گھنے بال اُس میں چھپ گئے۔ ٹوپی کھلی تھی، کانوں تک ڈھلک آئی اس سے پہلے کہ صورت کے یوں بدل جانے پر کسی کو ہنسی آئے تقریر شروع ہوگئی اور اُس کے بعد کسی نے یہ نہ دیکھا کہ مانگے کی جناح کیپ کب تک کانوں پر ڈھلکی رہی اور کب مقرّر نے اُسے اُتار کر میز پر رکھ دیا۔ یہ بڑی محنت سے تیّار اور بڑے جوش سے ادا کی ہوئی تقریر تھی، ترشے ہوئے فقرے، چُنے ہوئے الفاظ، خیال جس میں غور و فکر شامل تھا، جذبہ جو عمر کا تقاضا تھا، بے باکی جو تمیز تھی، اختلاف جو باادب تھا۔ جملے ہوں کہ خاموشی کے وقفے دونوں کی ادائیگی اسٹوڈنٹس یونین کی تربیت کا حاصل تھی۔ یہ تقریر انگریزی میں تھی،

اِس کے ابتدائی کلمات کا آزاد ترجمہ کچھ یوں ہو گا۔ اس خوش رنگ اور روشن شخصیت کے استقبال کے لیے حاضر تو ہو گیا ہوں مگر سوچتا ہوں، شروع کہاں سے کروں۔ اِس خطابت سے جسے کوئی نہ پہنچ سکا یا اُس محبّت سے جو ہر ایک کے حصّے آئی۔ اس سیاست سے جس میں آزردگی داخل ہے یا اس شاعری سے جس میں مسرّت شامل ہے۔ اِس نسبت سے جو اقلیت کو اکثریت سے ہوتی ہے یا اُس رعایت سے جو مساوات کہلاتی ہے۔ سارے رنگ شوخ اور ساری کرنیں روشن ہیں، نقطۂ آغاز ملے تو کیوں کر۔ میں کیوں نہ بات اُس تاریخی رشتے کے حوالے سے شروع کروں جو علی گڑھ اور ہندوستان کے درمیان قائم ہے یا اُس ذاتی تعلّق سے جو مہمانِ خصوصی نے مجھے ایک بار چھوٹا بھائی کہہ کر استوار کیا تھا۔ حالات ایسے بدلے ہیں کہ ہم یا تو چھوٹے بھائی ہیں یا بڑے دُشمن، درمیانی صورت کوئی بھی نظر نہیں آتی۔

سروجنی جب یونین ہال میں تقریر کے لئے کھڑی ہوئیں تو اُن پر گُل پاشی کی گئی۔ یونین ہال کی اِس رسم کا جواب میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ بڑے ملکوں کے بڑے

بڑے استقبال دیکھے۔ جاہ و حشم اور شان و شوکت کی کہیں کمی نہ تھی مگر پھر بھی
جو حُسن اور سادگی یونین ہال کی گُل پاشی میں ہے اُس کی یکتائی کو کوئی بھی نہ پہنچ
سکا۔ یونین ہال میں ڈائس کے بالکل اوپر چھت میں ایک مُستطیل شگاف ہے
جس کے چاروں طرف روشن دان میں اور اوپر لکڑی اور ٹین کی چھت پڑی ہوئی
ہے۔ اس چوکور سقفی روشن دان کے ارد گرد چھت پر گیندے کے سنہری
پھولوں کی پتّیاں منوں کے حساب سے ڈھیر کر لیتے ہیں۔ مہمانِ خصوصی جب
تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ عین اُس شگاف کے نیچے ہوتا ہے۔ اُس کی آمد
پر تالیاں بجتی ہیں اور وہ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ جونہی تالیاں مدہم ہوئیں اور وہ
تقریر کے لیے تیّار ہوا کہ اوپر سے پھولوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے
تھوڑی تھوڑی اور پھر بہت سی پتّیاں نیچے دھکیل دیتے ہیں، اِس اونچائی سے فرش
کی طرف اُوپر تلے گرتے ہوئے پھولوں کی لرزش اور ریزش دیدنی ہوتی ہے۔
پہلے وہ مینہ کی بوندیں لگتی ہیں، پھر آسمان سے زمین تک سہرے کی لڑیاں پروئی
جاتی ہیں۔ کہتے ہیں اچھے لوگوں پر نور برستا ہے۔ برستا ہو گا، مگر میں نے تو چند

اچھے لوگوں پر عرش سے فرش تک بہار کو برستے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ وہ سماں بندھتا ہے کہ جس نے ایک بار پھولوں کی برسات دیکھی وہ تمام عمر اُسے یاد رکھتا ہے اور جس پر ایک باریوں گُل پاشی ہو جائے وہ ساری عمر اِن پھولوں کے نیچے دبا رہتا ہے۔

خالدہ ادیب خانم پر جب گُل پاشی ہوئی تو وہ حیران ہو کر بار بار اوپر دیکھنے کی کوشش کرتیں کہ یہ پھول کہاں سے آرہے ہیں مگر ہر بار پتّیاں اُن کی نظر اور اُن کے چہرے کو ڈھک لیتیں۔ وہ اتنی متاثر ہوئیں کہ اِس رسم کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا جو برِّ عظیم کے سفر کے بعد لکھی تھی۔ آج گُل پاشی سروجنی پر ہوئی۔ دیکھنے والوں نے گُل و بُلبُل کا یہ نیا رشتہ بھی دیکھا۔ گُل تھا کہ آج بُلبُل پہ نثار ہو رہا تھا۔ بُلبُل کی باری آئی تو اُس نے کہا میں آج ایک طویل مدّت کے بعد یونین ہال میں آئی ہوں، پھولوں کی لڑیاں اور جوشیلے نوجوانوں کے جذبات کی کڑیاں ہی اِس مدّت کے دونوں سروں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ ہم نے پھول برسائے تھے، سروجنی نے جواب میں موتی لُٹانے شروع کر دیے۔

یونین ہال کا جلسہ ختم ہوا تو صُبح کے جلسے کی طرح ہجوم کا وہ عالم تھا کہ جو لڑکے اپنی آٹو گراف البم ساتھ لائے تھے وہ سروجنی تک نہ پہنچ سکے۔ میں اُن لڑکوں کے گروہ میں شامل نہ تھا۔ میری آٹو گراف البم گھر پر تھی اور اُس کے بیسویں صفحے پر سروجنی نائیڈو نے دستخط کر رکھے تھے۔ اِس صفحے کے ایک کونے پر میں نے یادداشت کے طور پر کلکتہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۴ء لکھا ہوا ہے۔ کلکتے میں ایک اُردُو کانفرنس تھی اور میں اُس میں طلبہ کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہوا تھا۔ کم سِنی کے دِن تھے اور میرے لیے دو مشکلات تھیں۔ ایک طوفان میل میں علی گڑھ سے کلکتے کا طویل سفر تنہا طے کرنا اور پھر وہاں پہنچ کر سروجنی نائیڈو ڈاکٹر بی سی رائے اور شیر بنگال اے کے فضل الحق کے سامنے تقریر کرنا۔ جوانی اور نادانی کے بہت سے فائدے ہوتے ہیں اور اِس موقع پر یہ دونوں جوہر بہت کام آئے۔ اب تو اِس موقع کی نزاکت کو سوچ کر کانپ جاتا ہوں۔ کلکتے کے اِس جلسے میں جب میرے بعد سروجنی نائیڈو نے تقریر کی تو میری دلجوئی کی خاطر دو چار جملے میرے بارے میں کہے اور مجھے چھوٹا بھائی کہہ کر مخاطب کیا۔ جلسے کے بعد میں

نے آٹو گراف البم سروجنی کو پیش کیا۔ وہ جہاں کھڑی تھیں وہاں بلب کی روشنی بہت مدّھم تھی۔ میں نے کہا دستخط بھی کر دیں اور کچھ نصیحت بھی لکھ دیں۔ کہنے لگیں کہ روشنی اتنی کم ہے کہ محض اندازے سے دستخط کر دیتی ہوں تم اُس کے اوپر خود ہی کوئی اچھی سی بات لکھ لینا اور اُسے میری جانب سے سمجھ لینا۔ سروجنی نے دستخط کیے تو انگریزی کے پہلے چار حروف روشن لکھے گئے اور باقی واضح مگر بُجھے بُجھے سے۔ میں نے اجازت کے باوجود اُن دستخطوں پر کوئی نصیحت نہیں لکھی۔ البتّہ اُن پر ایک مضمون ضرور لکھا ہے۔

میں نے سروجنی کی صرف تین تقریریں سُنی ہیں۔ ایک کلکتے میں اور دو علی گڑھ میں۔ آج مجھے اُن کے اتنے اقتباس یاد نہیں جتنے اُن تقریروں اور بیانوں کے جو میں نے اخبار یا کتاب میں پڑھے ہیں۔ جب میں نے سروجنی کو آخری بار سُنا تو اُن کی بعض مشہور تقریروں کو جو انہوں نے نوجوانی میں کی تھیں تقریباً پچاس برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس نصف صدی میں نہ اُن کا پیغام بدلا نہ پیامبری کے انداز۔ پیغام میں وہی تازگی اور پیامبری میں وہی دِلبری شامل تھی جس پر بیسویں

صدی کی پہلی دو نسلیں فریفتہ ہو چکی تھیں۔ جوانی میں اُن کی تقریروں میں پختہ کاری ملتی تھی۔ بڑھاپا آیا تو اُن میں جواں ہمتی جھلکنے لگی۔ ان کے موضوع میں عمر بھر یک رنگی رہی مگر اُن کے بیان کے سو رنگ تھے اور ہر رنگ ایک نیا، شوخ اور شاعرانہ رنگ تھا۔ پچاس برس کے بعد بھی اُن کی سحر بیانی میں عالی خیالی بدستور تھی، اور رومانی رنگینی برقرار تھی۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ دردمندی کی جگہ درد نے لے لی اور فکر کے ساتھ تفکّرات بھی نمایاں ہو گئے۔ وقت کے ساتھ مقرّر کی دِلکشی اور تقریر کی دلآویزی بڑھتی چلی گئی۔

سروجنی کی تقریر ایک اچھی غزل کی طرح دِلکش ہوتی، جس طرح غزل میں صدیوں سے مضامین کی تکرار کے باوجود تازہ غزل بھی ایک نوع ہے وہی کیفیّت سروجنی کی تقریروں کی تھی۔ سروجنی نے جوانی ہی میں یہ بتا دیا تھا کہ وہ خطابت کے ہنر کو جدوجہدِ آزادی کے لیے وقف کر چکی ہیں اور کسی قیمت پر اُس کے کسی دوسرے استعمال کو جائز نہیں سمجھتیں۔ یہ بات وہ ۱۹۱۷ء میں اِن الفاظ میں واضح کر چکی تھیں، تم میں بہت سے ایسے ہوں گے جنھوں نے پچھلے چند دِنوں میں مجھے

کئی بار سُنا ہے، وہ کہتے ہوں گے یہ تو صرف ایک ہی راگ الاپتی ہے لیکن قوموں کی تاریخ میں کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب یہ لازم ہو جاتا ہے کہ آپ کا ساز سِتار نہیں بلکہ محض اِکتارا ہونا چاہیے۔ سروجنی کے ہاتھ میں جو ساز تھا وہ اُس پر ساری عمر مسلمانوں کا ترانہ بجاتی رہیں۔

سروجنی نے بار ہا اپنی تقریروں میں اسلام اور مسلمانوں سے اپنا رشتہ جوڑا۔ عورتوں سے خطاب ہوا تو وہ پدمنی، ساوتری اور سیتا کے ذکر کے ساتھ ساتھ اُس احسان کا بھی ذکر کرتیں جو اِس صنف پر اسلام نے اُس کے حقوق تسلیم کرنے کے سلسلے میں کیا ہے۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جب لکھنو سیشن میں جگہ ملی تو یوں اعتراف کیا کہ اگر مجھے اِس مقام پر کھڑا ہونے کا کوئی حق حاصل ہے تو اُس کی بنیاد یا تو وہ اُلفت ہے جو مُجھے مسلم ہند کے جوانوں سے ہے یا وہ جد وجہد جو میں مسلمان عورتوں کے اُن حقوق کے لیے کرتی ہوں جو اسلام نے دیے ہیں مگر آپ نے پورے نہیں کیے۔ یہ بات وہ اکثر دُہراتی تھیں کہ اُن کے کانوں نے بچپن میں جو پہلی آوازیں سُنیں وہ امیر خسرو کی زبان میں تھیں اور جو پہلے دوست

بنائے وہ بھی مسلمان گھرانوں سے تھے۔ مسلم تمدّن سے سروجنی کی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمانوں کے شہر کی آوازوں اور دوسرے شہروں کے شور وغُل میں تمیز کرتی تھیں کیونکہ مسلمانوں کے شہر کی فضا میں اذان کی گونج ہوتی ہے جو ہر دوسری آواز سے مختلف اور اُس پر غالب ہے۔ وہ حافظ و رومی کے ساتھ جناح اور اقبال کا ذکر ان دِنوں کیا کرتی تھیں جب اپنوں نے بھی انہیں پوری طرح نہ اپنایا تھا۔

سروجنی نے ۱۵ جنوری ۱۹۱۷ء کو پنڈت موتی لعل نہرو کی صدارت میں ایک نہایت اعلیٰ تقریر کی جس کا بنیادی خیال محمد علی جناح کے اِس جملے سے مُستعار لیا تھا کہ روح کی بالیدگی تین تصوّرات سے عبارت ہے، عشق، ایمان اور حب الوطنی۔ قائدِ اعظم کی وفات پر جو پیغام سروجنی نے گورنر یوپی کی حیثیت سے مس فاطمہ جناح کو بھیجا تھا اُس میں ان تینوں تصوّرات کی جھلک ملتی ہے۔ پیغام میں لکھا تھا کہ ہزاروں ماتم کناں اپنے عظیم قائد کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں لیکن میں لذّتِ سکوتِ غم کی گہرائیوں سے محبّت آمیز یادوں کا ایک لازوال

پھول بھیج رہی ہوں جسے تُم میرے عزیز مرحوم دوست کی قبر پر رکھ دینا۔ اس پیغام کے بیس برس بعد قائدِ اعظم کا مزار مکمّل ہوا۔ میں دیکھنے گیا۔ مجھے سنگِ مرمر کے تعویذ پر تزئین برجستہ کے گُل بوٹوں میں سروجنی کا بھیجا ہوا یہ پھول بھی نظر آیا۔

مجھے معلوم نہیں کہ سروجنی نے دینِ اسلام کا کتنا مطالعہ کیا تھا مگر اِس بارے میں جو رائے اُس نے قائم کی وہ گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔ تیرہ سو برس کے بعد اسلام کے نظریات کی تازگی اور روح اسلام کی توانائی نے سروجنی کو بہت متاثر کیا۔ مساوات کے خواب کی تعبیر بھی اُسے اسلام میں نظر آئی اور اُس کے عملی نمونے کو دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ اسلام ایسا واحد مذہب ہے جو مساوات کو فلسفیانہ بحث سے نکال کر نماز کی صفوں میں لا کھڑا کرتا ہے اور پھر اُسے احرام کی چادریں پہنا کر عالمگیر بنا دیتا ہے۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی جو توانائی اسلام میں پائی جاتی ہے اُس کی وجہ سروجنی کو یہ نظر آئی کہ اس کا بیج ایک تپتے صحرا میں سادہ اور غیوّر لوگوں کے درمیان بویا گیا تھا۔ کچھ

سخت جانی ابتدائی ماحول نے پیدا کی، کچھ بہادری نسل در نسل ورثہ میں تقسیم ہوئی۔ تمام مذاہب میں اسلام کم عمر تو ہے مگر اِس بات میں سب پر سبقت رکھتا ہے کہ وہ روح اور بدن دونوں کے لیے نازل ہوا۔ دوسرے پیغامات اُس کے مقابلے میں ناتمام لگتے ہیں۔

سروجنی نے ایک بار مدراس کے نوجوان مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے قرآن مجید پڑھنے کا ذکر کیا تھا۔ معلوم نہیں اس کی نگاہ "مُؤَلِّفَةَ قُلُوبُهُم" اور وہ کہ ان کے دِلوں میں (کلمۂ حق کی) اُلفت پیدا کرنی ہے۔۔۔۔۔۔۔پر گئی کہ نہیں۔ دِل کا حال تو خُدا ہی بہتر جانتا ہے، مگر سروجنی کی زبان پر کلمۂ حق جاری تھا۔ ایک دِن مسلمانوں سے خطاب کیا تو کہا۔ "اگرچہ میں تمہارے دوش بدوش کھڑے ہونے کے باوجود تمہاری نظروں میں ایک کافرہ ہوں مگر میں تمہارے سارے خوابوں میں تمہاری شریک ہوں، میں تمہارے خوابوں اور بُلند خیالوں میں بھی تمہارے دوش بدوش ہوں کیونکہ اسلام کے نظریات بنیادی اور حتمی طور پر اتنے ترقّی پسند نظریات ہیں کہ کوئی انسان جو ترقّی سے محبّت کرتا ہو اُن پر

ایمان لانے سے انکار نہیں کر سکتا۔"

ذات پات اور چھوت چھات کی گھُٹی گھُٹی فضا کے مقابلے میں اسے وہ کھلی اور کشادہ فضا بہت پسند آئی جس میں رنگ نسل اور شرق و غرب کے جھگڑوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس برادری کے سب انسان برابر تھے۔ اور افضل صرف وہ تھا جو دوسروں سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ پرہیز گاری کا فیصلہ بھی انسان پر نہیں چھوڑا۔ یہ فیصلہ سب انسانوں کے سامنے ان کا خالق کرے گا۔ اس فضا میں سروجنی نے لمبے لمبے سانس لیے تو نفسِ مطلب اس پر عیاں ہو گیا اور اُسے بہت سے ایسے اصول حقیر نظر آنے لگے جنہیں لوگ عزیز رکھتے ہیں۔ اُسے حیرت ہوئی کہ انسان اپنی مختصر زندگی کا بیشتر حصّہ ایک تنگنائے میں بسر کر دیتا ہے حالانکہ آفاق اور کائنات کی ساری فراخی اُس کی منتظر ہے۔ سروجنی ہر تنگ نظری اور تنگ دِلی سے نفرت کرنے لگی۔ وہ علاقائی وفاداریوں اور صوبہ پرستی سے بھی متنفّر ہو گئی۔ اس نے ۱۹۰۳ء میں ایک تقریر صوبائی عصبیت کے خلاف کی۔ اُس نے اپنے سامعین سے کہا کہ تم اِس تنگ نظری کا شکار ہو جس کی وجہ

سے تمہارے افق کی ایک حد تمہارا صوبہ اور دوسری حد محض تمہاری اپنی ذات ہے۔ یہ محدود افق یہ مختصر کائنات، یہ مفلس ذہن، یہ عاجز فکر نفرت کے قابل ہے اور تم ہو کہ اِس تنگ نظری سے محبّت کرتے ہو۔ میں نے سفر کیا، میں نے سوچا، میں نے آس لگائی تو میری محبّت کا دامن وسیع ہو گیا۔ میری ہمدردیوں میں تنوّع پیدا ہو گیا ہے۔ مختلف نسلوں، قوموں، مذاہب اور تہذیبوں سے رابطہ رکھنے کی وجہ سے دوستو مجھے بصیرت مل گئی ہے۔ سروجنی کی تربیت میں نہ جانے کون کون سے عوامل ہوں گے مگر اُس کی بصیرت میں گنگا جل سے زیادہ آبِ زم زم کا اثر ملتا ہے۔

ایک بار گوکھلے نے سروجنی سے پوچھا کہ ہندو مسلم تعلّقات کا کیا حال ہے تو سروجنی نے کہا شاید پانچ سال میں یہ مسئلہ طے ہو جائے گا گوکھلے نے کہا، میری بچّی تو محض ایک شاعرہ ہے۔ تیری توقّعات کی سطح واقعات کی سطح سے ہمیشہ بُلند رہتی ہے۔ اس بُلند سطح پر وہ اپنے تخیّل اور تمنّاؤں کے ساتھ تنہا زندگی بسر کرتی رہی۔ وہ رُخصت ہوئی تو اس وقت بھی تنہا تھی۔ گورنمنٹ ہاؤس کے ایک طویل

وعریض کمرے میں وہ اکیلی سوئی ہوئی تھی۔ سوتے میں اُس کی آنکھ لگ گئی اور پھر وہ جاگ نہ سکی۔ جب موت کا فرشتہ آیا ہو گا تو اُس نے کہا ہو گا تنہا کیوں آئے ہو، تمہاری تعداد تو لاکھوں میں بیان ہوتی ہے۔ آج سے تم میرے سامعین ہو۔ آؤ میں تمہیں اپنی نظم "الوداع" سناؤں۔

کیا تمہیں اس کے سوا کوئی اور صلہ بھی چاہیے،

اے وہ جس نے مجھ سے میری متاعِ حیات چھین لی

اچھا میں تمہیں الوداع کے بغیر رخصت ہو جاؤں گی

اے مردہ خوابوں کے معبد، اے مرے آنسوؤں کے مندر،

اب اِس دنیا میں نہ سروجنی ہے اور نہ ہی والدہ محترمہ جنہوں نے ایک بار مُسکراتے ہوئے کہا تھا، یہ کافرہ کون ہے کہ جب جوان تھی تو باپ گرویدہ تھا اور بوڑھی ہوئی تو بیٹا شیدا ہے۔ بیٹے نے سوچا بھارت سراب ہے اور مہابھارت پیکار، بُلبُلِ ہند ایک پُکار ہے اور سروجنی ایک خواب۔ خواب اچھا ہو تو اسے بیان کرنا

چاہیے۔

(۱۲)

میں خواب سے بیدار ہوا اور حقیقت کی سنگلاخ دنیا میں واپس آ گیا۔ اس کے بدلتے ہوئے روز و شب پر غور کیا تو نئے نئے انکشاف ہونے لگے۔

ایک رات جاگ کر گزاری تو اس رات آزادی کی نعمت ہمارے حصّے میں آئی، یہ اگست ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ ایک رات سو کر اُٹھے تو دنیا ہی بدلی ہوئی پائی۔ مجلسِ قانون کو لا قانون قرار دیا جا چکا تھا اور آئین سے وفاداری کی حلف اُٹھانے والے اُسے منسوخ کر چکے تھے۔ یہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی بات ہے اس کے بعد ہر بلا خانۂ انوری پر نازل ہونے لگی اور برق نے بے چارے مسلمانوں پر گرنا سیکھ لیا۔ ہم نے لاکھ تقریریں کیں، خوش خیال اور دھواں دھار مگر تاریخ نے ہماری ایک نہ سُنی۔ ہم نے بڑے بڑے منصوبے تیّار کیے دنیا نے اُن کی تعریف بھی کی مگر تاریخ نے ہماری ایک بھی نہ چلنے دی۔ تاریخ نے اپنا رشتہ ہمارے اعمال کے

ساتھ استوار کر لیا اور ایک دِن ہمیں پابجولاں ڈھاکہ ریس کورس میں لا کھڑا کیا۔
یہ دسمبر ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ اُس روز ہم نے مُڑ کر اپنی تاریخ پر نظر ڈالی تو ہمیں یاد آیا کہ تاریخ کو کسی تاریخ داں نے جرائم، حماقتوں اور بدقسمتی کی فہرست کہا ہے۔ اگر ہماری تاریخ میں ۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست کے دِن نہ ہوتے تو ہم تاریخ کی اُس تعریف پر ایمان لے آتے۔

ہمارا شاعر یہ کہتا ہے کہ اہلِ ایمان جہاں میں خورشید کی مانند جیتے ہیں، اگر اِدھر ڈوب گئے تو اُدھر نکل آئے۔ ان میں سب کمزوریاں میں سوائے ڈوب جانے کے۔ اِسی طرح اگر اسلام کا جوش نمو جاودانی نہ ہوتا تو ہر کربلا کے بعد اُس کے زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور اب تک اُس کی داستاں بھی داستانوں میں شامل نہ ہوتی۔ ہمارا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ تاریخ کے ہر نازک مرحلے پر اسلام نے مسلمانوں کو بچایا نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کو۔ اپنے شاعر فلسفی کی رائے کی روشنی میں مجھے تاریخ کی نئی تعریف اور فلسفۂ تاریخ کی نئی تشریح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مجھے ایک ایسا مؤرّخ ملا جو تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں

اس شاعری کی تلاش کرتا ہے جو خدا کو پہچاننے میں مدد دیتی ہے۔ اس کی نظر میں انسان وہ چوبِ خشک ہے جس سے ہر دم آوازِ دوست آتی ہے اور خدا وہ ذات ہے جس سے انسان کو اس کا شرف اور شعور ملتا ہے۔ زندگی کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس مہلت میں انسان خدا سے اپنا تعلّق قائم کرے۔ تلاشِ حق میں انسان کی ساری صلاحیتیں حد کمال تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور روح انتہائی بُلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ جہاں کمال اور بُلندی بدل جاتی ہے جو صرف خدائے عزّ و جل اور بزرگ و برتر کے حضور پیدا ہوتا ہے۔ یہ رائے اُس انگریز مؤرّخ کی ہے جس نے اپنی طویل اور سلسلہ وار کتاب کا اختتام ایک طویل اور سلسلہ وار دعائیہ پر کیا ہے۔ یہ دعا برگزیدہ ہستیوں سے خطاب کی صورت میں ہے۔ مولانا روم کو مخاطب کیا اور کہا، اے موسیقی سے لبریز نَے، وہ نغمہ فردوس سُنا جو اُس نفس سے پیدا ہوتا ہے جو خُدا نے تُجھ میں پھونکا ہے۔ اس دُعا میں رسول اللہ سے شفاعت کی درخواست کی ہے تا کہ کمزور و ناتواں انسان کو اپنی ناطاقتی سے بُلند ہو کر حق کی خدمت کا موقع مل سکے۔ دُعا کا یہ سلسلہ قرآن مجید کی اس آیت پر تمام ہوتا

ہے۔ اِلَیْہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیعًا ہم سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔ یہ سارے حوالے دیکھنے کے بعد کسی نے تعجّب سے پوچھا کہ آرنلڈ جے ٹائن بی لا الہ کی پہلی منزل سے گزرے بغیر انا للہ کی آخری منزل تک کیونکر پہنچ گیا۔

ٹائن بی کی اہمیّت اُس کی شہرت سے زیادہ ہے مگر یہ اہمیّت اور شہرت دونوں اس کی کتاب "تاریخ کا ایک مطالعہ" پر مبنی ہیں۔ اِس کتاب کا موضوع کسی عہد یا علاقے کی تاریخ نہیں بلکہ تاریخِ عالم اور تاریخِ انسانی کا ایک ایسا جائزہ ہے جس کی رو سے ایک نیا فلسفۂ تاریخ قائم ہوتا ہے۔ ٹائن بی کے فلسفۂ تاریخ کا حاصل یہ ہے کہ تاریخ کے مطالعہ کے لیے موزوں اِکائی نہ مُلکوں کی غیر مُستقل سرحدیں ہیں نہ اُن کی عارضی حکمرانیاں، بلکہ تہذیب یا معاشرہ ہے۔ تاریخِ عالم میں اٹھائیس تہذیبوں کے نشان ملتے ہیں جن میں سے اٹھارہ فنا ہو چکی ہیں، نو زوال پذیر ہیں اور تنہا ایک ترقّی پذیر ہے مگر اُس کا مستقبل بھی دوسری تہذیبوں سے مختلف نہ ہو گا۔ بس اتنی سی بات تھی جسے ٹائن بی نے افسانہ بنا کر ہزارہا صفحات، تیرہ ابواب، دس جلدوں اور زندگی کے تینتیس سالوں پر پھیلا دیا۔ اب صدیوں کے بعد بھی

جب کبھی فلسفۂ تاریخ کا ذکر آئے گا تو لوگ پیچھے مُڑ کر ٹائن بی کی طرف بھی دیکھا کریں گے۔ معلوم نہیں اِس وقت ٹائن بی کے فلسفے اور اُس کی شخصیت کے نقش کتنے دُھندلے ہو چکے ہوں گے البتّہ میں نے جب اُنہیں ملتان میں اپنے سامنے بیٹھا ہوا پایا تو اُن کی فکر جواں تھی اور اُن کے چہرے پر وہ نکھار تھا جو صرف اس بڑھاپے میں پیدا ہوتا ہے جس کی جوانی ایک کامیاب ریاضت اور تپسیا میں گزری ہو۔ اُن کے چہرے پر بار بار مُسکراہٹ پھیل جاتی تھی اور جھُرّیوں سے چہرے پر یہ مصرعہ لکھا جاتا ہے۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ٹائن بی نے جوانی میں جب عروج و زوالِ یونان کی داستان سُنی تو اُس کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ آیا تہذیب مغرب کا انجام بھی یہی ہو گا۔ جرأت، محنت، استحکام، فتوحات، وسعت، کاہلی، عیاشی، تباہی، کھنڈرات کی کھدائی، عجائب گھر کی زینت، وہ یہ معلوم کرنے نکلا کہ تو اس نے ساری تاریخ پر نظر ڈالی۔ بے شمار مباحث نکل آئے۔ وہ جتنا غور کرتا مسائل اُسی قدر پیچیدہ ہوتے جاتے۔ ہر

تاریخی واقعہ جس پر وہ غور کرتا اُس کے موافق یا مخالف مثالیں مختلف ادوار اور مختلف اقوام کی تاریخوں میں نکل آئیں۔ ساری تاریخ لاتعداد ٹکڑوں میں علاقہ وار تقسیم تھی۔ ان علاقوں کی سرحد میں ہر وقت گھٹتی بڑھتی رہتیں۔ اچھّی اور بُری حکومتیں شاد کام اور نامراد لوگ بستی اُجڑتی آبادیاں، امن اور جنگ کے ناہموار وقفے، ایک ہی وقت میں مختلف علاقوں میں تاریخ کے متضاد مظہر، ایک ہی معاشرے اور ماحول میں کئی طبقاتی تضاد، ایک ہی عمل کے کتنے ہی مختلف نتائج، ایک نتیجے کے کتنے ہی عوامل۔ کوئی کم ہمّت ہوتا تو تھک کر بیٹھ جاتا، ٹائن بی نے سفر جاری رکھا۔ نتیجہ ظاہر ہے جو آگ لینے نکلتا ہے اسے پیغمبری مل جاتی ہے۔

ٹائن بی کا کہنا ہے کہ پانچ تہذیبیں پیدا ہوئیں مگر بن کھِلے مُرجھا گئیں۔ اکیس تہذیبیں ترقّی کے مختلف مدارج تک پہنچیں اور اُنہی میں سے دو اتنی دور تک پھیل گئیں کہ اُن کی دو شاخیں بجائے خود تہذیب کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ اِن تئیس تہذیبوں سے بیشتر گزشتہ سے پیوستہ ہیں۔ اور صرف چھ براہ راست ایّامِ

جاہلیت سے پیدا ہوئیں۔

تہذیب کی ابتدا کے بارے میں ٹائن بی نے نظریۂ مجاہدہ پیش کیا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ مشکلات سے مُقابلہ کرتے ہوئے جب کوئی معاشرہ فتح حاصل کرتا ہے تو تہذیب کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔ مشکلات جغرافیائی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً تکلیف دہ آب و ہوا یا تاریخی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً غلامی، حملے یا سرحدوں پر دباؤ، مُشکلات کے بارے میں یہ بھی ضروری ہے کہ نہ تو وہ اتنی آسان ہوں کہ اُن سے مقابلہ معمولی نوعیت کا ہو اور نہ وہ اتنی کڑی ہوں کہ مقابلہ کرنے والا گروہ نیست و نابود ہو جائے۔

تہذیب کا ارتقا طبّاع افراد کی اقلیّت کا مرہونِ منّت ہوتا ہے۔ یہ لوگ پہلے راستہ ڈھونڈتے یا تراشتے ہیں اور پھر اکثریت اُن کی پیروی میں اس راہ پر چل نکلتی ہے۔ تلاشِ راہ کے دوران طبّاع افراد کو تنہا یا ان پر مشتمل اقلیت کو رُخصت اور مراجعت کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سینٹ پال، سینٹ گریگوری، مہاتما بدھ، میکاولی، دانتے اور کتنے ہی ایسے طباع افراد پر وہی بات صادق آئی جو

افلاطون نے کسی غار میں رہنے والوں کے بارے میں کہی تھی۔ اگر غار میں رہنے والوں نے کبھی روشنی نہ دیکھی ہو اور ایک آدمی باہر نکل آئے تو پہلے اُسے روشنی کی ماہیت سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا اور پھر وہ واپس جا کر اس نور کا ذکر ساتھیوں سے کرے گا تو وہ سب اس پر ہنسیں گے اور موقع ملے تو جان سے مار ڈالیں گے، طبّاع اقلیتوں پر بھی تجربے کی یہی دو کیفیّتیں گزرتی ہیں کہ وہ عام روش سے ہٹ کر کچھ وقت نور کی دریافت میں صرف کرتی ہیں پھر واپس آ کر اکثریت کو ساتھ چلنے کی دعوت دیتی ہیں۔ جہاں اکثریت نے طبّاع افراد یا اقلیت کی پیروی کا صحیح حق ادا کیا وہاں تہذیب ترقّی پذیر رہتی ہے۔ بحث کو اِس نقطے پر پہنچا کر ٹائن بی نے زوال و انتشارِ تہذیب پر اپنی تحقیق اور اپنے نظریے کو پیش کیا ہے۔ میں تو ٹائن بی کے پاس تہذیب کی بنیاد، نشوو نما اور ارتقا کی داستان سُننے گیا تھا۔ اُس نے اُسے مختصر کیا اور زوال و انتشار کی بات لے بیٹھا۔ پہلے تو مجھے یہ مطالعہ عجیب اور غیر ضروری معلوم ہوا مگر اب اُس کے بارے میں رائے بدل چکا ہوں۔ نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جو اِس راز سے واقف ہوں کہ پرانی بنیادیں کیوں بیٹھ

گئیں۔

نظریۂ زوال و انتشارِ تہذیب ہی ٹائن بی کے علم و فکر کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اِس نظریہ میں وہ زوال کی وجوہات اور انتشار کی کیفیات کا ذکر کرتا ہے۔ زوال و انتشار کی بظاہر صورت یہ ہوتی ہے کہ طبّاعِ اقلیت میں طبّاعی کا فقدان ہوتا ہے اور وہ ایک جابر اقلیت میں بدل جاتی ہے۔ اکثریت ایسی جابر اقلیت کی محکوم تو رہتی ہے مگر وفادار نہیں ہوتی اور پیروی کے لیے نئے رہنما اور نئے راستے تلاش کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔

زوال تہذیب کو کئی مؤرخین نے جبریہ فلسفۂ تاریخ کا تابع ٹھہرایا اور یونان و روما کے زوال کو قانونِ قدرت سمجھا۔ سپنگلر نے کہا معاشرہ فرد کی طرح پیدا ہوتا ہے اور زندگی کے مختلف ادوار سے گزرتا ہوا موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ افلاطون اور ورجل کے یہاں بھی گردش کا فلسفہ ملتا ہے۔ بہت سے مفکّرین کہتے ہیں کہ تازہ خون کی آمیزش کے بغیر زوال لازم ہو جاتا ہے۔ اس جبریہ فلسفے کے مُقابل ایک قادریہ فلسفۂ تاریخ بھی ہے۔ اس کے تحت زوال اس وقت آتا ہے

جب ماحول اور معاشرے پر قادر رہنے کی صلاحیت ختم ہو جائے۔ مثلاً روم کی سڑکیں شکستہ اور میسوپوٹیمیا کی نہریں خشک ہو گئیں اور انہیں بنانے والے انہیں سنبھال نہ سکے تو اُن پر زوال آ گیا۔ گبن کا خیال ہے کہ روما کا زوال اس وقت شروع ہوا جب اُس میں ایک تازہ دم سپاہ اور ایک تازہ تر مذہب سے مُقابلہ کی قوّت باقی نہ رہی۔ اسی طرح مچھر کی فتوحات میں نمرود کی سلطنت علاوہ وہ تہذیبیں بھی شامل تھیں جو ملیریے کا مُقابلہ نہ کر سکیں۔ جہاں تک معاشرے کا تعلّق ہے گبن نے سلطنت روما پر قادریہ فلسفے کا اطلاق یوں کیا ہے کہ جب یہ سلطنت شمالی یورپ کی غیر مہذّب اور جنگجو قوموں سے لڑنے کی قوّت کھو بیٹھی تو اسے زوال آ گیا۔

ٹائن بی نے ان تمام نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے زوال کی وجہ خود ارادیت کی ناکامی بتائی ہے۔ جو طبّاعی کے فقدان سے پیدا ہوتی ہے۔ اُس کی کئی صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ جب معاشرے میں نئی سماجی طاقت کا اظہار ہو اور اُس کے مطابق پرانے اداروں میں تبدیلی نہ کی جائے تو ایسا انقلاب آ جاتا ہے جس میں سب کچھ

تباہ ہو جاتا ہے یا پرانے ادارے مسخ ہو جاتے ہیں اور نئی توانائی سلب ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ طبّاعی فائدہ بھی پہنچاتی ہے اور استقام بھی لیتی ہے۔ طبّاعی سے کسی بڑی صورتِ حال پر فتح پا لیجیے تو اُس کے بعد عین ممکن ہے کہ اپنی صلاحیتوں پر اعتماد اور غرور اتنا ہو جائے کہ آئندہ عام صورتِ حال میں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ یہ دوسری صورت مجھے صورتِ حال سے ملتی جُلتی نظر آئی۔ کبھی ہماری طبّاعی کا یہ عالم تھا کہ خالی ہاتھ اور خالی جیب تھے اور نیا ملک بنا لیا۔ سپاہ اور خزانہ ملا تو خود فریبی میں اِس ملک کا آدھا حصّہ گنوا دیا۔ تیسری صورت کسی کامیاب ادارے مثلاً شاہنشاہیت، پارلیمنٹ اعلیٰ ذاتیں یا پاپائیت سے ایک ایسا مہلک لگاؤ ہے کہ جب ان سے وابستگی نقصان دہ ثابت ہو تب بھی اُن سے علیحدہ نہ ہو سکیں۔ چوتھی صورت اسی قسم کی اس وابستگی سے متعلّق ہے جو کسی ایجاد یا اصول سے پیدا ہو جائے۔ آلاتِ حرب یا جنگ کے اصولوں میں ایک گروہ ترقّی کرتا ہے اور اُن کی بدولت دوسروں کو شکست دیتا ہے مگر اِن اصولوں پر وہ اُس وقت بھی کار بند رہتا اور اُن آلات کو اُس وقت بھی کار آمد سمجھتا ہے۔ جب یہ

اصول اور آلات از کارِ رفتہ کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں نتیجہ ظاہر ہے جن کی مدد سے ماضی کو فتح کیا تھا انہی کی بدولت حال کو شکست ہو جاتی ہے۔ جن پہ تکیہ ہو وہی پتّے ہوا دینے لگتے ہیں۔ صرف پتّوں کا خزاں دیدہ ہونا شرط ہے۔

زوالِ تہذیب کی پانچویں صورت کو خود کُشی بتوسطِ لشکر کشی کہا جاتا ہے۔ یونان میں زوال کے اس نسخے کو تین الفاظ میں یوں بیان کرتے تھے افراط، غیر ذمہ داری، تباہی۔ آشوریوں نے جنگ کے فن میں بے حد ترقّی کی اور ہر فتح کے بعد اپنی جنگی صلاحیت میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ اُن کی فتوحات پے در پے مدّت دراز تک جاری رہیں مگر اُن کی تعمیر میں اک صورت خرابی کی بھی مُضمر تھی۔ جنگ کے سلسلہ دراز کے ساتھ ساتھ توانائی پہلے تقسیم ہوئی، پھر تفریق ہوئی اور حاصل ضرب صفر نکلا۔ یہ جو آشوریوں پہ گزری وہ بائیبل کے مطابق گولیتھ، بن حداد اور آہب پر بھی گزری۔ اِس اصول کی کچھ اور اسناد بھی ہیں۔ فلپ دوم نے جب برّی فوج ہالینڈ کے خلاف اور بحری فوج انگلستان کے خلاف بھیجی، نپولین سوم نے جب پرشیا پر حملہ کیا، ولیم دوم نے جب بلجیم پر چڑھائی کی، شار لیمیں

نے جب پانچ بار اٹلی پر حملہ کیا اور تیمور لنگ نے جب بیالیس سال جنگوں میں بسر کر دیے، تو یہ تمام کامیاب سپہ سالا محض یہ اصول ثابت کر رہے تھے کہ اگر جنگ کا دائرہ وسیع کیا جائے تو لشکر کشی اور خود کُشی مترادفات بن جاتے ہیں۔

زوال کی چھٹی صورت کامیابی کا نشہ ہے۔ کامیابی ایک عارضی سکون اور ایک دائمی آزمائش کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ایک مسئلہ عارضی طور پر حل ہو جاتا ہے مگر کئی اور مسئلے توجّہ طلب بن جاتے ہیں۔ نشہ اقتدار کا ہو یا کسی اور کامیابی کا، وہ اِس کی مہلت نہیں دیتا کہ نئے مسائل کا احاطہ کیا جائے۔ یہی مہلت کی کمیابی کامیابی کے لیے مہلک ہوتی ہے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں یہی نشہ جو فوجی فتوحات سے پیدا ہوا تھا وہ روم کی سلطنت کے زوال کا باعث ہوا اور تیرہویں صدی میں یہی نشہ جو روحانی فتوحات سے پیدا ہوا تھا پاپائیت کے زوال کا باعث بنا۔ روم میں فوجی فتوحات کا نشہ ایسا چڑھا کہ نہ خود آرام کیا نہ کسی کو آرام کرنے دیا۔ امن کی ضرورت تو جیتنے والے کو بھی ہوتی ہے اور ہارنے والا ہمیشہ امان چاہتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں موجود تھیں۔ بالآخر یہ صورت ہو گئی کہ روم نے جس پر

حملہ کیا اُسے ہتھیار ڈالنے میں بھی اپنی نجات نظر نہ آئی اور جس فوج سے حملہ کیا اُس کے سپاہیوں کو فتح میں بھی کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ یہ بے دِلی سے لڑے اور وہ بے جگری سے۔ روم کو شکست ہوئی اور یہ شکست ایسے سپاہیوں کی شکست تھی جنہیں اگرچہ فاتح عالم کہتے تھے مگر اِس بھری دنیا میں اُن کے ذاتی استعمال کے لیے چپّہ بھر زمین بھی نہ تھی۔ وہ کب تک اِن احکام کی خاطر جانیں گنواتے، جن کا مقصد دوسروں کی ناجائز دولت اور حکومت کا تحفظ تھا۔ نقدِ جان کو یوں ضائع ہوتا دیکھا تو روم کے سپاہی پورس کے ہاتھی بن گئے۔

زوال کی ساری وجوہات کو اکٹھا کیجئے تو صرف ایک وجہ بنتی ہے یعنی ملک میں اتّفاق اور یک جہتی کا فقدان۔ ٹائن بی کے یہاں زوالِ تہذیب محض ایک سنگِ میل ہے۔ یہاں پہنچ کر اونچائی ختم ہو جاتی ہے۔ باقی راستہ نشیب میں طے کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ انتشارِ تہذیب کی منزل آ جاتی ہے جہاں اُس تہذیب کی تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔ اِس کے بعد اُس تہذیب کے قصّے، اساطیر الاوّلین کہلاتے ہیں اور اُس کے آثار سطحِ زمین پر کم اور اُس سے نیچے زیادہ ہوتے ہیں۔ اِس

مرحلے پر اُس تہذیب کا حال درس عبرت میں لکھ لیتے ہیں اور اس کے آثار کو محکمہ آثارِ قدیمہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اُس مردہ تہذیب کے مٹّی کے ٹھیکروں پر عجائب گھروں میں ٹکٹ لگ جاتا ہے۔ اور یہ آمدنی زندہ اور موجود تہذیب کے کام آتی ہے۔

انتشارِ تہذیب کی ماہیت کا جائزہ لیتے ہوئے ٹائن بی اِس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جب معاشرہ ٹکڑے ٹکڑے اور روحِ عصر فگار ہو تو جان لیجئے کہ انتشار مکمل ہو چکا ہے۔ معاشرے کے تین ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ جابر اقلیت، بیزار عوام اور نا مہرباں ہمسائے۔ روح جب فگار ہوتی ہے تو لوگوں کا رویّہ، احساسات اور طرزِ زندگی بالکل بدل جاتے ہیں۔ معاشرہ جب پارہ پارہ ہوتا ہے تو وہ محض اُس داخلی حقیقت کا اظہار ہے کہ معاشرے کی روح زخمی ہو چکی ہے اور زخم اُس معاشرے کے ہر فرد کے دل پر لگ چکے ہیں۔ دل زخمی ہوں تو تبدیلی دو طرح کی ہوتی ہے، فعالی یا انفعالی۔ طباعی کی جگہ بے جا اضطرار پیدا ہو جاتا ہے یا غیر ضروری احتیاط۔ طباعی کی تقلید کرنے والی اکثریت یا تو نافرمان ہو جاتی ہے یا اتنی فرمانبردار کہ خواہ

مخواہ موت کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ جہاں تک احساسات کا تعلّق ہے، ان میں بے کسی اور بے دِلی نمایاں ہو جاتی ہے۔ طرزِ زندگی میں ایک روش قدامت پسندی کی ہوتی ہے اور دوسری جدیدیت کی۔ دونوں غیر حقیقت پسند طریق ہونے کی وجہ سے ٹکراؤ اور تشدّد کا باعث بنتے ہیں۔ زندگی ایک بے معنی اور بے مقصد وقفہ بن جاتی ہے جس میں مختلف اثرات یوں گھُل مِل جاتے ہیں کہ وہ ایک بے ربط ڈھیر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اخلاق پست اور مذاق پست تر ہو جاتا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں کثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان پہلے فصاحت و بلاغت کھو دیتی ہے پھر بولیوں میں بٹ جاتی ہے۔ فلسفہ ہائے حیات اور مذاہب ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا سارا نظام بے ترتیب نظر آتا ہے۔ پھر اِس گرتی دیوار کو کسی طباع، کسی سپہ سالار، کسی فلسفی یا کسی اوتار کا سہارا ملتا ہے۔ مگر وہ عارضی ہوتا ہے۔ یوں گرنا اور ساقی کا گرتوں کو تھامنا شاعری میں بار بار مگر تاریخ میں صرف تین بار ہوتا ہے اور اس کے بعد جو گرا وہ نیست و نابود ہو گیا۔

ٹائن بی تو تہذیب کو نیست و نابود کرنے کے بعد بھی کتاب ختم نہیں کرتے۔ ایک آدھ نہیں بلکہ پوری پانچ جلدیں اس نکتے کے بعد لکھی ہیں گو یہی اُن کا مرکزی خیال تھا۔ یہ نکتہ ہمیں ٹائن بی سے پہلے بھی چند مؤرخین یا مفکّرین کے یہاں ملتا ہے۔ مثلاً ابنِ خلدون جس کی ٹائن بی نے بہت تعریف کی ہے۔ ابنِ خلدون نے اقوام و ملل کی ترقّی اور زوال پر تاریخ اور اجتماعیت کے فلسفی کی حیثیت سے پہلی بار غور کیا۔ اُس کا خیال ہے کہ ترقّی کے لئے بدوی عصبیت اور فضیلت کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد یا مثال کا ہونا ضروری ہے۔ ابنِ خلدون کے یہاں زوال کے بھی تین اسباب ہوتے ہیں، ضعف اشراف، تشدّد افواج اور لہو و لعب۔

سینٹ آگسٹائن نے انسان کی تاریخ کو صرف آٹھ دِنوں کی داستان ٹھہرایا ہے۔ انسان کی پیدائش سے آج پانچ دِن گزر چکے ہیں۔ ہم سب چھٹّے دِن میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ جانے یہ کتنی صدیوں تک جاری رہے۔ ساتویں دِن توبہ قبول ہو گی اور آٹھویں دِن ابد الآباد تک قائم رہے گا۔ انسان آج کل توبہ میں مصروف

ہے جو خدا سے محبّت کرے گا وہ خدا کے شہر میں داخل ہو گا اور جو اپنی ذات سے محبّت کرے گا وہ شیطان کے شہر میں داخل ہو گا۔ انسان کی تاریخ انہی دو شہروں کی تاریخ ہے۔ فرد کی زندگی تو سرپٹ موت کی طرف رواں دواں ہے مگر مجموعی طور پر انسان کی تاریخ ایک طویل ہفتے پر محیط ہے۔ کب یہ ہفتہ ختم ہو اور کب انسان کی جنّتِ گم گشتہ اس کے ہاتھ آئے۔

گیام بتستہ ویکو قوموں کی زندگی کو حیات انسانی کی طرح درجہ بدرجہ بدلتے اور بڑھتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اُس کی سوچ کی رو سے پہلے دیوتاؤں کا دور آتا ہے پھر عظیم انسانوں کا اور بعد میں عام انسانوں کا۔ آخری دور کے دو حصّے ہیں۔ دورِ جمہور اور دورِ شاہی۔ دورِ شاہی پر آکر انسان کی تاریخ مکمّل ہو جاتی ہے۔ جو زبردست بادشاہ ہوتا ہے وہ دوسروں کو غلام بنالیتا ہے۔ لوگ غلامی میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ پھر اِس خاک سے ایک نیا بادشاہ نئے جہان کی خوش خبری لے کر پیدا ہوتا ہے۔

سپنگلر کے یہاں ویکو کا اثر ملتا ہے اور ویکو کے یہاں ابنِ خلدون کا۔ سپنگلر کے

فلسفۂ تاریخ میں پہلے بہار پھر گرما پھر خزاں اور آخر کار سرما کا موسم آتا ہے۔ بہار عبارت ہے پیدائش اور افزائش سے۔ گرما شباب کے دور کو کہتے ہیں۔ خزاں ادھیڑ عمر کو اور سرما موت کی ٹھنڈک کا نام ہے۔ کلچر انہی منازل سے گزرتا ہے۔ بہار ویکو کے دیوتاؤں کے دور کی طرح ہے۔ اِس دور میں عرب میں گنبد، کلاسیکی کلچر میں ڈورک تعمیرات اور مصر میں اہرام تعمیر ہوتے ہیں۔ پھر گرما کا موسم آتا ہے۔ اپانشد، لوتھر اور کالوِن کے افکار کے ساتھ کلاسیکی تعمیر میں آئی اونک، مغرب میں باروک اور عرب میں اسلامی طرزِ تعمیر ایجاد ہوتی ہے۔ خزاں آئی تو ہر شے مکمّل تھی۔ مذہب، فلسفہ، ادب، تعمیر، ذہانت، ایجاد اور دریافت۔ سرما کی آمد تھی کہ حدّت و حرارت میں کمی آگئی۔ ہر شے کی ماہیت بدلنے لگی۔ مذہب کی جگہ خرافات، فکر کی جگہ بے فکری، صراطِ مستقیم کی جگہ بے راہ روی، یقین کی جگہ بے یقینی۔ سپنگلر کے نزدیک اِن چاروں موسموں کی ایک مکمّل گردش میں ایک ہزار سال کی مدّت صرف ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں میں کتنے ہی واضح

اشارے موجود ہیں جن سے قرآنی فلسفۂ تاریخ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ اِس سلسلے میں مسلمان مؤرخین اور مفسّرین کی رائے سے ٹائن بی کی رائے کا موازنہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ تین آیات کے حوالے سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ٹائن بی کی فکر قرآن مجید سے کس قدر قریب اور متاثر ہے۔ یہ تینوں آیات قرآنی فلسفۂ تاریخ سے متعلّق ہیں اور اِن میں وہ اصول بیان کئے گئے ہیں جو اٹل اور محکم ہیں۔ کوئی قوم، ملک، ملّت، امّت، تہذیب، معاشرہ یا کلچر اِن اصولوں سے مستثنٰے نہیں، سبھی اِن کے تابع ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ ٱللَّهِ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا۟ مَا بِأَنفُسِهِمْ خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی جسے خود اپنی حالت کے بدلنے کا خیال نہ ہو۔ کیونکہ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَـٰنِ إِلَّا مَا سَعَىٰ نہیں ملتا انسان کو کچھ مگر بغیر کوشش کئے ہوئے۔ دوسرا اصول شکست و فتح یا عروج و زوال کے بارے میں ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَٰمِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَٰتٌ وَمَسَـٰجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا ٱسْمُ ٱللَّهِ كَثِيرًا اگر ہم بعض کو بعض پر

فوقیت نہ دیتے تو معبدوں، مسجدوں، گرجوں میں خدا کا نام لیوا کون رہ جاتا، تیسرا اصول فنا کا ہے یعنی کسی قوم، سلطنت یا اقتدار کو دوام نہیں۔ **اِلَیۡہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا** سب کو اُس کی طرف لوٹنا ہے۔ ٹائن بی نے بھی تو تاریخِ عالم کی طویل داستان پڑھنے، اُس پر عمیق غور کرنے اور اس کا دقیق تجزیہ کرنے کے بعد اپنے مطالعہ، تاریخ کو اسی آیت پر ختم کیا ہے۔ اسلام پر ایمان لانا ہو تو وہ ٹائن بی کی معرفت بھی لایا جاسکتا ہے۔

ٹائن بی کے سامنے تاریخِ عالم کے بکھرے ہوئے لاتعداد اوراق سینکڑوں ملک، ہزاروں حکومتیں، بے شمار جنگیں پھیلی ہوئی ہیں اور بے حساب بادشاہ، سپہ سالار۔ فلسفی ایسے کھڑے ہیں کہ دیکھنے والے کو واقعات اور انسانوں کا ایک بے ترتیب ہجوم نظر آتا ہے۔ مگر ٹائن بی کے سامنے یہ ہجوم اقلیدسی شکلوں میں تقسیم ہے۔ طرح طرح کی شکلیں بنتی ہیں مگر سب متعیّن اور واضح ہیں۔ اس ہجوم میں ایک نظم اور نمونہ ہے جسے ہر ایک کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ یہ ایک معمّا ہے مگر چند اشخاص کے پاس اس کا حل موجود ہے۔ جو اس کا حل رکھتے ہیں اُن کی

نظر اس ہجوم میں چھوٹے سے چھوٹے واقعات پر بھی رہتی ہے۔ نیوٹن نے کہا تھا میں علم کے بحرِ ذخار کے کنارے سپیاں چُن رہا ہوں۔ ٹائن بی تاریخ عالم کے بحرِ ذخار پر وہ سلیمانی قدرت رکھتے ہیں کہ ان کا حکم لہروں پر چلتا ہے۔ وہ لہر کو علیحدہ کر لینے اور اُس کی کیفیّت بیان کرنے پر قادر ہیں اور کبھی کبھی یہ جاننے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ اِس لہر کا ہر قطرہ کہاں سے کشید ہوا تھا۔ اُن کا جواب علمی ہوتا ہے حتمی نہیں۔ وسعتِ نظر کا یہ عالم ہے اور اس کتاب میں اتنے حوالے ہیں کہ اِسے انسائیکلوپیڈیائی درجہ حاصل ہے۔ متن سے ہٹ کر محض فٹ نوٹ اور ضمیمے پڑھیں تو پتہ چلے گا کہ ٹائن بی نے کیا کیا سمیٹا ہے اور اسے کہاں کہاں پیوند کرتے اور کس کس کام میں لاتے ہیں۔ دنیاوی کاموں میں انتہائی مصروف رہنے والوں کے بعض بڑے علمی کارناموں کا ذکر آیا تو وہ کلیر نڈن، ابنِ خلدون، پولی بس، دانتے، اولیویر، میکاولی، کنفوشس، سینٹ گریگوری، جوزیفس، سینٹ لویولا تھیوسیڈائی دس، زمینوفان، رسول اللہ ﷺ، سولون، گروتے، شلیمان، لارڈ برائس، والٹر لیف، انتھونی ترولپ، گین، جے ایس مل اور

رشید الدّین الہمدانی کی مثالیں اُنگلیوں پر گنا دیتے ہیں۔ اِن میں سے کئی نام میرے لیے آج بھی اجنبی ہیں اور میں اِس کے علاوہ اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ بھرپور عملی زندگی بسر کرنے کے باوجود بھاری بھر کم علمی کام بھی کر گئے ہیں۔ کم فرصتی کا رونا رونے والوں کے لیے اس فہرست سے بڑھ کر کوئی اور تازیانہ کیا ہو گا۔

ہمدانی نے وقت کے استعمال اور کام کی تیز رفتاری کے اصول بنا رکھے تھے وہ کم سے کم فراغت میں بڑے سے بڑا کام کر سکتے تھے۔ جامع التواریخ انہوں نے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے لکھی تھی اور یہ علمی کام ایسے نہیں ہوا جیسے آج کل بڑے لوگ ہم زاد کے لکھے پر دستخط ثبت کر کے مصنّف بن بیٹھتے ہیں۔ وہ طریقہ جو بچّوں کی پیدائش کے لیے حرام ہے وہ کتابوں کی تصنیف کے لیے کیونکر حلال ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ دور روشن خیالی کا دور شمار ہوتا ہے، بعض لوگ اب اولاد کی پیدائش کو بھی محض اشاعت کے کاروبار کا درجہ دیتے ہیں۔

ہمدانی نے فجر اور صبح کے درمیان تاریخ کا لکھنا جاری رکھا اور اِس کے علاوہ اُس کا

تمام وقت فرائضِ منصبی کی نذر ہو جاتا۔ انھونی ترولپ اس ملازم کو پانچ پونڈ سالانہ انعام دیتے تھے جو صبح کے ساڑھے پانچ بجے اُنہیں گرم کافی لا کر دیتا تھا۔ یہ تو محض جاگنے کا بہانہ تھا۔ کیونکہ صبح ناشتہ تک ترولپ اپنے علمی مشاغل میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔ صُبح ہوتے ہی اس پر فرائضِ منصبی کی یلغار ہو جاتی۔ کون کہتا ہے میں صبح اِس لیے کام کرتا تھا کہ میرے گھر میں کوئی ناشتے پر کوئی عصر کے وقت اور کوئی رات کو مجھ سے گفتگو کا خواہش مند ہوتا۔ بیکار ہمسائے وقت بے وقت آنکلتے۔ جب چاند چڑھتا تو میری جان نکل جاتی کیونکہ گھر والے اُن دِنوں مجھے آوارہ گردی پر اپنے ساتھ لے جاتے اور میرے قیمتی وقت کا خون ہو جاتا۔ گروتے نے اپنے بیڈروم میں ایک گھنٹی لگائی ہوئی تھی جس کی رسّی ایک چوکیدار باہر سے منہ اندھیرے ہلا دیتا اور بنک کا یہ مصروف ملازم اُٹھ کر تاریخ نویسی میں مصروف ہو جاتا۔ بیدار مغز لوگ راتوں کو بھی بیدار رہتے ہیں اور گھنٹی کی آواز اُن کے لیے صورِ اسرافیل سے کم نہیں ہوتی۔

ٹائن بی کی دقّتِ نظر کا یہ عالم ہے کہ اُس کے لیے زمان و مکان کی قیود بے معنی ہو

گئی ہیں۔ اُس کے لیے ہزارہا سال سمٹ اور سکڑ جاتے ہیں۔ اُس کا ذہن پھیلتا اور اُن پر حاوی ہو جاتا ہے۔ وہ ہزاروں سال کے فاصلے کو چشمِ زدن سمجھ کر طے کرتا اور اتنے بُعد کے باوجود لوگوں اور واقعات میں ربط، معنی اور ہم آہنگی تلاش کرتا ہے۔ ازل سے ابد تک فاصلہ اتنا طویل ہے کہ چھ ہزار سال کی تاریخِ انسانی کو ٹائن بی ایک لمحہ قرار دیتا ہے۔ اس نے اقرار کیا کہ چھ بار اُس کی زندگی میں ایسا بھی ہوا کہ کسی کتاب کو پڑھتے یا کسی تاریخی مقام کو دیکھتے ہوئے وقت یوں پیچھے لوٹ گیا کہ اُس کے سارے حواس نے محسوس کیا کہ وہ خود اِس واقعہ کا چشم دید گواہ اور اِس ڈرامے کا اصل کردار ہے۔ اُس نے تاریخ اور مقام کے ساتھ ساتھ تجربوں کی تفصیل لکھی ہے۔ یہ کام پڑھنے والے کا ہے کہ وہ اُن تجربات کی تفصیل پڑھنے کے بعد طے کرے کہ یہ بات زورِ بیان کے لیے بیان ہوئی ہے یا اِن تجربوں کی کوئی اور حقیقت بھی ہے۔ ممکن ہے بعض آدمی اِسے نفسیاتی عارضہ قرار دیں اور بعض اِسے داخلی حسّیات کا شاعرانہ اظہار سمجھیں مگر میں نے اِن تجربات کو صوفیانہ واردات کی صف میں شامل کر لیا ہے۔ معراج میرے

ایمان کا حصّہ ہے اور ایسی قلبی واردات کو میں نے معراج کا پرتو جانا ہے۔

ٹائن بی کے تجربات میں زمان و مکان کی قید سے آزادی کا ایک سمبل وہ تصویر بھی ہے جو فرا اینگلیکو کی بنائی ہوئی ہے اور لندن کی نیشنل گیلری میں رکھی ہوئی ہے۔ اِس کا عنوان حسنِ نظر ہے اور اِس تصویر میں یسوع مسیح، فرشتے، پیغمبر، برگزیدہ ہستیاں اور بہت سے ایسے لوگ جو تاریخ کے مختلف ادوار اور دنیا کے مختلف علاقوں میں پیدا ہوئے تھے اکٹھے کھڑے ہیں۔ کبھی کبھی دل میں یہ خیال آتا ہے کہ حشر میں ندامت سے جھُکی ہوئی نظروں کو اگر شفاعت کی بدولت اوپر اُٹھانے کا موقع ملا تو برگزیدہ ہستیوں کا وہ اجتماع نظر آئے گا جس کی مختصر اور بے جان نقل نے ٹائن بی کو اس قدر بصیرت عطا کی تھی۔ ٹائن بی نے جب سالہا سال کی محنت کے بعد ایک شام اپنی کتاب کی آخری سطر میں لکھیں تو پہلے وہ اس تصویر پر ایک نظر ڈال کر آئے۔ زمان و مکاں اِس حسنِ نظر اور حسنِ بصیرت میں یوں سمٹ آئے جیسے روز لینڈ مرے نے بیان کیا ہے۔

میرا جذبہ خواہ غم، بے کسی کا ہو، خواہ جوشِ طرب کا، کبھی تنہا نہیں ہے۔ لاتعداد

رفیق جنہیں میں جانتا بھی نہیں میرے پاس کھڑے میرے ساتھ ماتم یا مسرّت میں شریک ہیں۔ یہ میرے گمنام و بے نشاں دوست ہیں جو میری پیدائش سے ہزارہا سال پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

گزرے ہوئے زمانوں کے بے نشاں باشندوں سے جب دوستی بڑھی اور بصیرت نے گزشتہ سے پیوستہ مستقبل پر غور کرنا شروع کر دیا تو بالآخر وہ لمحہ بھی آ گیا جب دوسری جنگِ عظیم کے دوران ایک دِن وکٹوریا اسٹیشن لندن کی عمارت کے سامنے وقت بالکل تھم گیا اور ٹائن بی نے اپنی ذات کو ماضی حال اور مستقبل کی ایک وحدت میں گم پایا۔

نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

وہ جو گزر چکا ہے، جو ہو رہا ہے اور جو آئے گا وہ سب کچھ اُس نے اپنی ذات کے ارد گرد دیکھا اور محسوس کیا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وقت کے دھارے میں وہ خود محض ایک بے نام لہر ہے۔ اُس نے بڑی حسرت کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ اِس

تجربے کی تاریخ درج کرنے سے رہ گیا۔ مجھے البتّہ خوشی ہے کہ ایک چھوٹا سا تجربہ ایک دِن مجھے بھی ہوا اور اُس کی تاریخ میرے لیے ٹائن بی نے اپنے قلم سے لکھ دی۔ یہ ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کی بات ہے، میں نے محسوس کیا کہ ایک بہت بڑا دھارا میرے سامنے بہہ رہا ہے اور میں محض ایک گمنام لہر ہوں۔ اس لمحہ میں وکٹوریا اسٹیشن کی عمارت کے سامنے کھڑا نہ تھا بلکہ ایک جلسے کی صدارت کر رہا تھا، جس میں ٹائن بی مہمانِ خصوصی تھے۔ یہ بات ملتان شہر کی ہے۔ آتش اُن دِنوں جوان بھی تھا اور ڈپٹی کمشنر بھی۔ میں اُس جلسے کی صدارت کے اعزاز سے خوش تھا مگر دِل میں ایک چبھن اور اُداسی تھی۔ مجھے رہ رہ کر ایک انگریز افسر کا طنزیہ جملہ یاد آتا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ ٹائن بی کے مطالعۂ تاریخ کے خلاصے کی پہلی جلد تُم نے ناحق خریدی ہے۔ ایسی کتاب کے مطالعہ کے لیے جو فرصت، رغبت اور اہلیت چاہیے وہ سرکاری ملازم کے حصّے میں نہیں آتی۔ میں نے اُس جملے کا طنز مدّت تک برداشت کیا مگر اِس رائے سے اتّفاق نہ کیا۔ ایک بار فرصت ملی تو میں نے بڑی رغبت سے اس مصنّف کو پڑھ ڈالا۔ جس دِن اور جس جلسے کا

میں ذکر کر رہا ہوں اُس وقت میں نے مطالعہ تاریخ تو نہیں لیکن اُس کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھ رکھا تھا۔ میں نے صدرِ جلسہ کی حیثیت سے جب ٹائن بی سے ملاقات کی تو وہ عجب انکسار سے ملا۔ میں نے چند جملے خیر مقدم کے لیے کہے، پھر یہ کہا کہ مجھے تین انگریزوں سے ملنے کا شوق تھا۔ برنارڈ شا، چرچل اور ٹائن بی۔ سوچتا تھا کبھی انگلستان میں اُن دِنوں قیام ہو کہ عام انتخابات ہو رہے ہوں اور چرچل اُمّیدوار ہو۔ میں اُس کے انتخابی جلسے میں اُس کی تقریر سُنوں اور ممکن ہو تو اُس پر آوازے کسوں تاکہ اُس کی حاضر جوابی کا لطف اُٹھا سکوں۔ اِسی طرح یہ بھی چاہتا تھا کہ ایک دِن برنارڈ شا کا مہمان رہوں اور اُس تنک مزاج طنز نگار میں چھپے ہوئے خوش مزاج انسان کو دریافت کروں۔ جی نے یہ بھی چاہا کہ کبھی ٹائن بی مل جائے تو اُس سے پوچھوں کہ بھئی دنیا بھر کا غم دِل میں اور دنیا بھر کی تاریخ دماغ میں کیسے سماتی ہے اور پھر یہ سب ممکن ہو تو اتنے بڑے کینوس پر تینتیس برس تک ایک ہی تصویر کی مصوّری کیونکر ممکن ہے۔ اس تصویر کا خاکہ ذہن میں کیسے آیا اور کیوں کر سمایا۔ اتنے بڑے کام کی ہمّت اور لگن کہاں سے لائے۔ جب

کام ادھورا اور جنگ زوروں پر تھی اور ساری محنت رائیگاں جانے کا خطرہ تھا تو تمہارے دِل پر کیا گزرتی تھی۔ ٹائن بی نے تقریر میں میری اِس بات کا جواب بھی دیا اور کچھ جواب تو اُس کی دسویں جلد میں بھی موجود ہے۔ مسئلہ کتنا چھوٹا یا کیسا ہی بڑا ہو، وقت کتنا کمیاب یا کتنا وافر ہو، مسئلہ زیرِ بحث پر خوب سوچیے اور جب موضوع پر گرفت پوری ہو جائے اور اُس کا خاطر خواہ خاکہ ذہن میں آ جائے تو پھر اُس کے جزو بنایئے۔ ہر ایک جزو کو بذاتِ خود مسئلہ بنا کر اُس کے خاکے بنایئے یہاں تک کہ وہ اِکائی آ جائے جس پر آپ پڑھنا بند اور لکھنا شروع کر دیں۔ وقت کی تقسیم یوں کریں کہ بیک وقت تین کام کیے جا سکیں۔ جو تیّار ہو اُسے لکھیں، جو تیّار کرنا ہو اُس پر جو مواد موجود ہو اُسے پڑھیں اور جو کچھ اُن دونوں کے بعد لکھنا ہے اُس کا خاکہ سوچتے رہیں۔ گویا بیک وقت تین مختلف تحریروں کے بارے میں کام کرنا چاہیے اور یوں کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام ہو جائے گا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک وقت میں ایک کام کیا ہوتا تو ٹائن بی کو مطالعۂ تاریخ کے لیے تین گُنا وقت درکار تھا۔ یوں تینتیس سال لگے

تب پوری ایک صدی گزر جاتی۔

ٹائن بی کی تقریر ختم ہوئی تو میں نے اُسے اساتذہ طلبا اور ملتان کے زمینداروں سے باتیں کرتے دیکھا۔ ہر شخص پر اُس نے پوری پوری اور علیحدہ علیحدہ توجّہ دی۔ بات غور سے سُنی، جواب نرمی سے دیا، پھر خود سوال پوچھا اور اگر جواب تسلّی بخش ملا تو شکریہ ادا کیا۔ کسی بات پر اختلاف ہوا یا کوئی کج بحثی یا ہٹ دھرمی پر اُتر آیا تو اُس تحمّل سے سُنا کہ اُسے حیرت ہوئی اور اتنی دیر تک سُنا کہ وہ تھک گیا۔ یہ صرف اتنا کہیں گے کہ آپ نے جو کچھ کہا وہ آپ کے نقطۂ نگاہ سے بے شک درست ہو گا۔ مگر دوسروں کا نکتۂ نگاہ دوسرا ہے۔ شاید آپ اس پر بھی غور کرنا پسند کریں گے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہر شخص سے ایسے سوال کرتا تھا جس پر مخاطب اپنے آپ کو ٹائن بی کے برابر یا قدرے افضل سمجھے۔ وہ ایک طالبِ علم تھا جس کے لیے اُس سے ملنے والا ہر شخص اُس کا اُستاد تھا۔ یہ طالبِ علم کا کمال تھا کہ وہ دریافت کرے کہ اُس کا مخاطب کس چھوٹے یا بڑے معاملے میں اُس کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ یہ بتایئے آپ کے شہر میں چھوٹی اینٹ کے مکانات کِس

زمانے کے ہیں اور اب آپ کے یہاں تعزیے نکلنے پر جھگڑا کیوں نہیں ہوتا۔ کیا ملتان شیعہ کلچر کا اہم مرکز ہے۔ آپ کے یہاں زمینداری اور پیری مریدی کا کیا تعلّق ہے۔ آپ کی نظر میں اسلام کا مُستقبل کیا ہے۔ ہر شخص ٹائن بی کی تربیت کر رہا تھا اور وہ سوال پوچھنے پر مصر تھا۔ جلسہ ختم ہوا تو وہ ایک مقامی ہیڈ ماسٹر کے ساتھ اندرون شہر اُن کی حویلی میں ظہرانے کے لیے چلا گیا۔ وہاں تک تو سواری بھی نہیں جاتی تھی۔ تنگ گلیوں، اُبلی نالیوں، اور اُونچی دیواروں کے اِس محلے میں وہ چند دِن بڑے مزے سے رہا۔ رات وہ مجھے کھانے پر ملا۔ کچھ دیر اُس سے گفتگو ہوئی۔ فروتنی اور انکسار کا وہ عالم تھا کہ مجھے اس کا طرزِ تپاک دیکھ کر ندامت سے پسینہ آگیا، پسینہ خشک ہوتا اور پھر آتا رہا، گو بظاہر میں ہنس ہنس کر اُس سے گفتگو کر رہا تھا۔ میں نے جیب سے آٹو گراف بُک نکالی۔ ٹائن بی نے قلم کھولا، دستخط کئے عیسوی تاریخ لکھی، سر اُٹھایا اور مُسکرا کر کہا میں ہجری سن بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ ابھی اسلام اور اُس کے مستقبل پر گفتگو کر رہے تھے بتایئے ہجری سن کون سا ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ ٹائن بی نے فوراً سر جھکا لیا، اُس کا اشارہ واضح

تھا۔ اسلام کی تاریخ وہ لوگ کیونکر بنا سکتے ہیں جنہیں تاریخ تک یاد نہ ہو۔ صرف باتیں بنانے سے کہیں تاریخ بنا کرتی ہے۔ ٹائن بی نے ۲۹ فروری ۱۹۱۰ء کے نیچے یکّم رمضان ۱۳۷۹ھ لکھا اور موضوع بدل دیا۔ چلتے ہوئے ٹائن بی نے کہا آپ جب بھی لندن آئیں مجھ سے ملنا نہ بھولیے گا۔ میں نے انہیں اُس دِن کے بعد ایک روز واشنگٹن میں دیکھا، وہ عالمی خوراک کانگرس میں قحط اور انسان کی تاریخ کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ میرے اور اُن کے درمیان ایک ہزار کا اجتماع حائل تھا۔ میں نے اُن تک پہنچنے کی کوشش ہی نہ کی۔ جب بھی جی چاہتا ہے کہ اُن سے ملاقات کروں تو میں مطالعہ تاریخ اُٹھا لیتا ہوں یا اپنی آٹو گراف البم۔

حسنِ نظر کے عنوان سے ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی تصویر ہوتی ہے مگر بیشتر اُسے دیکھے بغیر گزر جاتے ہیں۔ اُسے نظر بھر کے دیکھنا حسنِ اتّفاق کہلاتا ہے جو ہر ایک کے حصّے میں نہیں آتا۔ میں فرا اینگلیکو کی تصویر کا کام اپنی آٹو گراف البم سے لیتا ہوں۔

(۱۳)

میں نے آٹوگراف اہم کا ایک ورق اور اُلٹا۔ ایک ہی صفحے پر نظریں جمائے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ ٹائن بی کے دستخط پر یوں رُکنے اور تہذیب کے عروج و زوال کی داستان میں کھویا رہنے کے بعد تاریخ کو ذرا نزدیک سے دیکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ اب جو البم کا ورق اُلٹا تو تاریخ ایک جیتی جاگتی صورت میں سامنے آ گئی۔ ٹائن بی تو محض ایک تاریخ دان ہے اور یہ دستخط ایک تاریخ ساز شخصیت کے ہیں۔ مؤرّخ اور معمار کا یہ فرق میری اختراع نہیں بلکہ میری یادداشت ہے۔ دراصل جملے کی یہ ترکیب میں نے تیس سال پہلے اسٹریچی ہال میں سُنی تھی۔ یہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے، ہال ہجوم سے اور ہجوم جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ جلسے کی صدارت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر جناب اے بی اے حلیم کر رہے تھے۔ اُن دِنوں علیم صاحب شعبۂ تاریخ کے صدر بھی تھے۔ جب وہ استقبالیہ پیش کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو وہ لوگ جو اُنہیں بارہا اور سالہا بُردباری سے سُنتے چلے آئے تھے ایک درست مگر طویل اور سپاٹ تقریر کے لیے تیّار ہو گئے۔ حلیم

صاحب نے مہمانِ خصوصی کو مخاطب کیا اور کہا قائدِ اعظم مجھے آپ سے ایک نسبت ہے، میں آج کل تاریخ پڑھا رہا ہوں اور آپ ان دِنوں تاریخ بنا رہے ہیں۔ میں تاریخ کا طالبِ علم ہوں اور آپ سیاسیات کے اُستاد۔ حلیم صاحب معلّم اور مقرّر کی حیثیت سے خواہ کیسے بھی رہے ہوں مگر اُس روز اُن کی زبان سے یہ جستہ اور بر محل جملہ نکلا اور تاریخی ہو گیا۔ یہ وہ دِن تھے جب علی گڑھ کو فکر و نظر کی برتری حاصل تھی اور اُس کی تعریف یوں کی جاتی تھی کہ جو کچھ علی گڑھ آج سوچتا ہے وہ ہندوستان کل سوچے گا۔

حلیم صاحب کو میں نے یونیورسٹی کی تقریبات میں صدر اور مقرّر کی حیثیت سے اتنی بار دیکھا ہے کہ اب تعداد کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ تاہم اُن کے دو جلسے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ایک بار اُن کے رویّے پر حیرت ہوئی اور دوسری بار اُن کی تقریر پر رشک آیا۔ رشک تو اُس جلسے میں آیا تھا جس کا ذکر کر چکا ہوں مگر حیرت والا واقعہ اُس سے تین چار سال پہلے یونین ہال میں گزرا تھا۔ ایک طالبِ علم نے جو انگریزی زبان کا بڑا اچھا مقرّر تھا ایک زور دار تقریر کی۔ جب مقرّر

جوش و خروش کے انتہائی درجہ پر پہنچا تو اُس نے کہا، جنابِ والا اُس روز میرا شرم کے مارے ڈوب مرنے کو جی چاہا جس دِن میں نے یہ سُنا کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کانگرس کے باضابطہ ممبر بن چکے ہیں۔ یہاں کی صورتِ حال یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ہر دلعزیز پرو وائس چانسلر نے بھی مسلم لیگ کا ممبر بننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سامعین یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ دورِ حاضر کی تاریخ کا یہ تقاضا پورا کرنے کے لیے علیم صاحب آج، ابھی اور اِسی لمحے ہم سب کو گواہ بناتے ہوئے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان فرمائیں۔ نعروں اور تالیوں میں وہ آہنگ بھی شامل ہو گیا جو پچھلی اور قدرے اُونچی نشستوں پر بیٹھے ہوئے طالبِ علموں کے لکڑی کے پائدان پر بے اختیار پاؤں پٹخنے سے پیدا ہو رہا تھا۔ اِس اثنا میں مقرّر نے اپنی شیروانی کے دو تین بٹن کھولے اور قمیص کی جیب سے مسلم لیگ کی رُکنیت کی کاپی نکالی اور ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ حلیم صاحب صرف اِس فارم پر دستخط کر دیں، اُن کی رکنیت کی فیس کے دو آنے میں اپنی جیب سے ادا کر دوں گا۔

تقریر اس نقطۂ عروج تک پہنچی تو میری توجّہ حلیم صاحب کے حال سے ہٹ کر اُس طالبِ علم کے مستقبل پر جا لگی جو تقریر کر رہا تھا۔ مجھے وہ نوجوان بظاہر بڑا خوش نصیب نظر آیا۔ جوانی میں اُسے ایک ہنر عطا ہوا، اُس ہنر کے مظاہرے اور مصرف کے لیے تاریخ نے جگہ بنا دی۔ وہ ایک اچھا مقرّر ہے اور اگلے دس برس جدوجہدِ آزادی کو بہت سے مقرّر درکار تھے۔ حسنِ اتّفاق کہ یہ نوجوان قائدِ اعظم کو پسند آ گیا۔ روایت ہے کہ انہوں نے اُسے بیٹا کہا اور اپنے ساتھ دہلی لے گئے۔ کچھ عرصہ تک اچھی اچھی خبریں آتی رہیں۔ پھر خاموشی کا وقفہ آیا۔ اُس کے بعد بُری بُری خبریں آئیں اور پھر وہ بھی بند ہو گئیں۔ وہ شخص اب بھی زندہ ہے۔ پہلے وہ مشہور تھا، نوجوان تھا اور مقرّر تھا، اب وہ خاموش ہے بوڑھا ہے اور گُم نام ہے۔ شہرت ہاتھ باندھ کر گھر آئی تو اُسے کھڑے کھڑے لوٹا دیا۔ گمنامی کے گھر خود نشے کی حالت میں چل کر گئے تو اُس نے مشکیں کس دیں۔

وقت کی شناخت اور شخصیت کی پرکھ واقعی بڑا مشکل کام ہے۔ اکثر اِس کام کو معاش کی سختی اور مزاج کی نرمی اور زیادہ کٹھن بنا دیتی ہے۔ اگرچہ علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی کو تحریکِ پاکستان کا ہراول دستہ کہتے ہیں مگر اِس ادارے کے بااثر اور مقتدر اساتذہ نے شروع میں بڑی اجنبیت اور تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ دو ایک معروف اساتذہ نے تو کھل کر اُس کی مخالفت کی اور آخر تک نبھائی۔ بارش کا پہلا قطرہ بہت چھوٹا اور حقیر تھا۔ جب ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی شاخ مسلم یونیورسٹی میں قائم کی گئی تو اُس میں صرف عبد السّتّار خیری، عمر الدّین، بابر مرزا، عابد احمد علی اور جمیل الدّین احمد شامل تھے۔ دو سال کی مختصر مدّت کے بعد وہ دِن بھی آ گیا کہ سوئمنگ پول کے سبزہ زار میں یونیورسٹی اساتذہ کی انجمن کی جانب سے قائدِ اعظم کو ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ ہر شخص اُن کی وفاداری کا دم بھرنے لگا۔ قائدِ اعظم نے جو یہ منظر دیکھا تو ہنستے ہوئے فرمایا جب کسی غریب کے دِن پھرتے ہیں تو وہی رشتہ دار جو پہلے اُس سے آنکھیں چراتے تھے اُس کی راہ میں آنکھیں بچھانے لگتے ہیں۔

چرچل کے بارے میں ایک مضمون کی تعریف میں نے ایک دوست سے کئی بار سُنی ہے۔ مضمون دوسری جنگِ عظیم سے قریباً پچیس برس پہلے لکھا گیا تھا۔ جب

ونسٹن چرچل ایک جوان سیاستدان تھا۔ اُس کے مستقبل کے بارے میں مصنّف نے لکھا تھا کہ یہ بات عین ممکن ہے کہ چرچل ایک دِن انگلستان اور اُس کی شکست کے درمیان حائل ہو جائے اور تنہا تاریخ کا رُخ موڑ دے۔ نہ جانے وہ گُم نام مصنّف کون تھا۔ جو پیش گوئی اُس نے کی تھی اُس میں اتنی غیر معمولی سچائی ہے کہ وہ علم الغیب معلوم ہوتی ہے۔ محمد علی جناح کے بارے میں کوئی گم نام غیب داں یوں پیش گوئی نہ کر سکا۔ مگر تین مشہور ہستیوں نے اُن کے مستقبل کے بارے میں بڑی دل لگتی بات کہی تھی۔ اُن تین نجومیوں کے نام یہ ہیں مسٹر مانٹیگو، مسز سروجنی نائیڈو اور علّامہ اقبال۔

مانٹیگو برطانوی کابینہ کے رُکن تھے۔ اُن کے قلم دانِ وزارت کو سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کہتے تھے اور اِس وزارت کے سبب وہ برطانوی ہند کے تمام بڑے آدمیوں سے خوب واقف تھے۔ ۱۹۱۷ء میں مانٹیگو نے محمد علی جناح کے بارے میں لکھا کہ یہ سراسر ظلم ہے کہ وہ شخص جو اس اہلیت کا مالک ہو اسے کاروبارِ مملکت میں کوئی حصّہ نہ ملے۔ اگرچہ یہ محض اہلیت کا اعتراف تھا مگر اُسے قائدِ

اعظم کی کامیابی کی وجہ سے پیشگوئی کا درجہ بھی مل گیا ہے۔

محمد علی جناح کی سیاسی زندگی کے آغاز میں اُن کے مستقبل کے بارے میں سب سے بڑی بات سروجنی نائیڈو نے کہی تھی۔ سروجنی نے ۱۹۱۸ء میں محمد علی جناح کی ابتدائی تقریروں کے مجموعہ کے لیے ایک دیباچہ لکھا تھا۔ اِس میں قائد کی مسلمہ اہلیّت اور بُلند اخلاق کے ذکر کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ تاحال اِس شخص کے پاس صرف قابلیت ہے مگر اس کے مقابل کوئی قابلِ ذکر کارنامہ نہیں ہے، ہو بھی کیونکر جب کہ یہ نوجوان ابھی ابھی کامیابی کی دہلیز تک پہنچا ہے۔ سروجنی نے اس شُبہ کا اظہار بھی کیا کہ انگلستان میں حاصل کی ہوئی تعلیم سے پیدا ہونے والی لاتعلقی اور قومی زبان سے ناواقفیت سے پیدا ہونے والے فاصلے کی وجہ سے جناح اس عوام دوستی اور ہردلعزیزی کی کبھی خواہش بھی نہ کر لیں گے جو مولانا محمد علی جوہر اور گاندھی جی کے حصّے میں آئی ہے۔ اِس مضمون کے آخری جملے بڑے معنی خیز ہیں۔ سروجنی نے لکھا کون ہے جو آنے والی سحر کے اسرار کی پیشگوئی کر سکے۔ کون ہے جو غیب کی اِن قوّتوں کا پیش بیں ہو جو تقدیر کو گا ہے

ہمارے سہانے خوابوں سے بھی ارفع مقام پر فائز کرتی ہیں۔ شاید کاتبِ تقدیر نے یہ لکھ دیا ہو کہ وہ شخص جس کی جائز خواہش یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا گوکھلے بنے وہ ہماری قومی جدوجہد کے کسی عظیم مگر کرب ناک مرحلے سے آزادیٔ ہند کے ماذینی (نجات دہندہ اٹلی) کی لازوال شہرت لے کر نکلے۔ سروجنی نے محمد علی جناح کے لیے جن نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا اُن میں شاعری، دعائیہ اور پیشگوئی تینوں کا امتزاج ملتا ہے۔ سروجنی کے اندیشے غلط ثابت ہوئے اور اُس کی نیک خواہشات پوری ہو گئیں۔

شاعرِ مشرق نے قائدِ اعظم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں شاعری کو کوئی دخل نہیں۔ وہ تحریر میں اگرچہ سیاست کے حوالے سے ہیں مگر اُن میں سیاست کو بھی کوئی خاص دخل نہیں ہے۔ اقبال نے اپنی رائے کا اظہار مانیگو کی طرح سرکاری کاغذات میں یا سروجنی کی طرح کتاب کے دیباچہ میں نہیں کیا۔ علامہ اقبال کی رائے ذاتی نوعیت کی ہے اور اُس کا اظہار بڑے خلوص اور درد کے ساتھ خفیہ اور نجی خط و کتابت میں کیا گیا ہے۔

علامہ نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو ایک خط میں قائدِ اعظم کو لکھا کہ مسلم ہند آپ کی فراست سے توقع رکھتا ہے کہ اِس نازک مرحلہ پر آپ اِس مشکلات کا حل تلاش کر لیں گے۔ تین ہفتے بعد علامہ اقبال نے ایک اور خط میں لکھا، میں آپ کی مصروفیات سے واقف ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا یوں بار بار خط لکھنا آپ کو گراں نہ گزرے گا کیونکہ پورے برطانوی ہندوستان میں تنہا آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس کی طرف مسلمانوں کی نظریں محافظت اور رہنمائی کے لئے اُٹھتی ہیں۔ علامہ اقبال کی اس رائے کو میں پیشگوئی کا درجہ نہیں دیتا۔ یہ تو حق شناسی کی وہ منزل ہے جہاں مرشد کسی مامور من اللہ کو پہچان لیتا ہے اور خود شناسی میں اُس کی مدد اور رہنمائی کرتا ہے۔ یہ سلسلہ معرفت اور نثر کا ہے۔ اگر بات سیاست اور نظم کی ہوتی تو علّامہ اقبال اس شعر کو قائدِ اعظم سے منسوب کرتے۔

می رسد مردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند

دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

کلامِ اقبال میں کتنے ہی شعر ایسے ہیں جو قائدِ اعظم کے لیے موزوں ہوں گے مگر جو بات اِس شعر میں ہے وہ کسی اور شعر میں نہیں ملتی۔ اِس میں وہی بات شاعرانہ انداز میں کہی گئی ہے جو خط میں باندازِ محرمانہ لکھی گئی تھی۔

میں نے علّامہ اقبال کو صرف ایک بار دیکھا ہے۔ اگرچہ وہ کم سنی اور ناسمجھی کا زمانہ تھا لیکن اُس ایک جھلک کے بعد میں اس احساسِ محرومی سے محفوظ ہو گیا کہ علّامہ اقبال کا زمانہ ملا اور اُن کو دیکھ بھی نہ سکے۔ اب رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ اگر انہیں اس قدر قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا جو قائدِ اعظم کے سلسلے میں میسّر آیا تو شاید مایوسی ہوتی۔ اُن کے شعر پڑھنے اور اُن کی تعلیمات پر غور کرنے کے بعد جو کردار ذہن میں تشکیل پاتا ہے وہ علّامہ اقبال کی شخصیت سے بہت کم اور قائدِ اعظم کی شخصیت سے بہت زیادہ قریب ہے۔ ہم نے اقبال کے شعر اور جناح کی شخصیت سے محبّت کی اور دونوں طرح سے فائدے میں رہے۔ سُنا ہے مغربی پاکستان کے ایک گورنر جو اب اس دنیا میں نہیں رہے یہ فرمایا کرتے تھے کہ ان دو وکیلوں میں ایک شیخ تھا دوسرا خوجہ۔ اِن دونوں کو حکومت سے کیا

واسطہ، اِن کے پاس تو چھوٹی سی زمینداری بھی نہ تھی۔ مرحوم کا کیا ذکر بہت سے لوگ خسارے کا سودا خوب سوچ سمجھ اور ٹھوک بجا کے کرتے ہیں۔

فکر ہر کس بقدرِ ہمّت اوست

مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریباً ساڑھے سات سو سال جم کر حکومت کی ہے۔ اس کے بعد سو برس انہیں اِس سلطنت کے مختلف علاقے کھو دینے میں لگے یہاں تک کہ حکومت سمٹ کر شاہی قلعے تک محدود ہو گئی۔ انگریز کو شاید شاہی مشاعرے اور اُردُو غزل سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اِس لیے انہوں نے غزل کے مغل بادشاہ کو جلا وطن کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد نوّے برس تک انگریز نے خوب مزے سے حکومت کی۔ جب اُس کی رُخصت کا وقت آیا تو کاروبارِ سلطنت کا مسئلہ پیچیدہ ہو چکا تھا۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کے لئے طرزِ حکومت کا انتخاب ایک بالکل نیا اور اہم تاریخی مرحلہ تھا۔ بادشاہت سے جمہوریت تک کے سفر کے لیے جو وقت درکار تھا وہ برِّعظیم کو میسّر نہ آیا۔ جب ترقّی یافتہ ملک اِس سفر کی منزلیں طے کر رہے تھے یہ برِّعظیم انگریزوں کی غلامی سے دوچار ہو گیا۔

آزادی کی جدوجہد جب کامیابی کے نزدیک پہنچی تو پتہ چلا کہ اِس کی دو شکلیں ہیں۔ یہ بات اُن دِنوں شاید کم لوگ جانتے تھے کہ آزادی کی جو شکل انگریزوں کی حکومت کے ختم ہونے پر متعیّن ہو گی دو صدیوں تک اِس برِّ عظیم کی تاریخ پر اثر انداز رہے گی۔ مسلمانوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ سیاسیات کی فکرِ جدید اور نظامِ حکومت کی طرزِ جدید کے مطابق اپنی منزل کا انتخاب کریں۔ جمہوریت کی نئ اور مسلم حقیقت کا گہرا اور دور رس جائزہ ضروری ہو گیا۔ جدیدیت کا تقاضا تھا کہ ہم بظاہر وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے ایک اقلیت بنا کر دوسرے درجے کے شہری بن جائیں۔ اِس صورت کو نافذ اور مُستقل کرنے کی بڑی عالمانہ اور عیّارانہ کوششیں کی گئیں۔ اِس کے لیے ایک طرف اتّحاد، وطن اور اخوّت کے گیت سنائے گئے اور وہ دوسری جانب پاکستان کی غیر یقینی صورت اور یقینی غربت سے ڈرایا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ اگر پاکستان بن گیا تو تاج محل ہندوستان میں رہ جائے گا۔ یہاں تاج محل سے میری مراد ایک عمارت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایک گروہ سے ہے جسے ہندوستان

میں رہ جانا تھا۔ بڑے بڑے پنڈتوں نے خانہ جنگی، تبادلۂ آبادی اور پھر دونوں ملکوں کے درمیان خوفناک جنگوں کی بھی پیش گوئی کی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں اِس برِّ عظیم کی حکومت میں مسلمانوں کو کیا حصّہ ملے۔ مگر اِس فیصلے پر ایک بہت طویل مستقبل کا انحصار تھا۔ مسلمانوں کی قیادت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ حکومت میں حصّہ نہیں لیں گے بلکہ برِّ عظیم میں اپنا حصّہ مانگیں گے۔ جس نے یہ مطالبہ سُنا حیرت ہوئی۔ بیشتر کو مسلمان اقلیت کی اِس جرأت پر اور کچھ لوگوں کو مسلم قیادت کی اِس فراست پر۔

یہ سعادت قائدِ اعظم کے حصّے آئی کہ وہ جمہوری سیاست کے آغاز پر برِّ عظیم کے مسلمانوں کے قطعی اور دوامی فیصلے کو مرتب کریں۔ اِس فیصلے کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں۔ نظریۂ پاکستان کو چند لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب برِّ عظیم میں پہلا شخص مسلمان ہوا اُس روز پاکستان وجود میں آ گیا تھا اور جب تک اِس سرزمین پر ایک مسلمان بھی موجود ہے پاکستان قائم رہے گا۔ نظریۂ پاکستان اور مملکتِ پاکستان دو مربوط مگر مختلف حقیقتیں ہیں۔ جو لوگ اِن میں فرق نہیں

کرتے وہ ایک حادثے کے بعد یہ کہنے لگے کہ ایک خطۂ زمین کے ہاتھ سے نکل جانے کے ساتھ یہ نظریہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ یہ لوگ قائدِ اعظم اور اُن کے نظریے کو نہیں سمجھے۔ نظریے کی جگہ دِل میں ہے اور مملکت کی نقشے پر۔ سرحد میں مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں مگر یہ نظریہ تو ایک بنیاد ہے جو ہمیشہ کے لئے بھری جا چکی ہے۔ اِس پر آنے والے لوگ حسبِ توفیق عمارتیں بناتے رہیں گے۔ کبھی چھوٹی کبھی بڑی کبھی بہت بڑی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک نصف ہو گیا تو اِس نظریے کی اہمیت دوچند ہو گئی۔

مسلم ہند کی تاریخ میں قائدِ اعظم کا مقام کیا ہو گا یہ سوال اُن کے ذہن میں بار بار اُٹھتا ہے جن کے دِل اِس عظیم شخصیت کی یاد سے پُر ہیں۔ ایک دوست نے یہ کہا کہ وہ برِّ عظیم میں ٹیپو سلطان کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی شخصیت ہیں۔ دوسرا کہنے لگا کہ وہ اورنگ زیب کے بعد کار زار کفر و دیں میں کامیاب ہونے والے پہلے مسلمان سیاست دان ہیں۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک بقول اقبال ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا اور دوسرا دورِ حاضر میں ہمارے

ترکش کا پہلا تیر ہے۔ تیسرے دوست نے اُن دونوں سے اختلاف کیا اور کہا کہ تاریخی حیثیت رکھنے والی شخصیات کا باہم مقابلہ محض خیال آرائی ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ تحریک اور نظریۂ پاکستان کا موازنہ تاریخ کے اُن واقعات سے کیا جائے جو مسلم ہند کیلئے اِس قدر اہم اور عہد آفریں تھے۔ اِس طریقہ سے قائدِ اعظم کی جگہ تاریخ میں خود بخود متعیّن ہو جائے گی۔

تاریخ پر نظر دوڑائی تو کتنی ہی فتوحات اور کتنے ہی فاتح یاد آئے۔ ہم نے پہلی نظر میں تین واقعات کو منتخب کیا۔ محمود کا سومنات، شہاب الدّین کا تھانیسر اور ابدالی کا پانی پت سومنات سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر وہ تاریخ کی رومانی شرح ہو جائے گی جسے قائدِ اعظم کی حقیقت پسندی کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم نے نظر انداز کر دیا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی کا مسلم ہند پر خوشگوار اثر پڑا۔ مگر وہ ناکافی تھا کیونکہ اُس کا جیتنے والا کسی اور طرف نکل گیا۔ شہاب الدّین غوری کے مقصد اور حاصل سے ہم نے قائدِ اعظم کے نظریے اور مملکت کا موازنہ کیا تو اُن دونوں میں بڑی مناسبت اور یگانگت نظر آئی۔

برِّ عظیم کے مسلمانوں میں ملّت کے وجود کا احساس اور اُس کے اظہار کے لیے ایک ریاست کی اساس رکھنا بارہویں صدی میں سلطان شہاب الدّین غوری اور بیسویں صدی میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کے حصّے میں آیا۔ شہاب الدّین غوری نے برِّ عظیم میں مسلمانوں کی جو حکومت قائم کی وہ خاندانوں اور علاقوں کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ساڑھے چھ سو سال قائم رہی۔ اِس عرصے میں حکومت کی استواری اور کمی کا کام بڑے بڑے سلاطین کے حصّے میں آیا مگر وہ سب ایک سلسلے سے منسلک تھے جس کا بانی شہاب الدّین غوری تھا۔ پھر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ انگریز آئے، جمہوریت آئی، نیشنلزم آیا۔ ایک طرف ایجاد و دریافت کا ڈھیر لگ گیا اور دوسری طرف نظریات اور تعصبات کا انبار لگ گیا۔ دنیا یکسر بدل گئی۔ یہ نئی دنیا سیاسی تنظیم، جلسہ، جلوس، تقریر، بیان، قرار داد، مطالبہ، بحث، مذاکرات، انتخاب، قانون، آئین اور راست اقدام کی دنیا تھی۔ اِس نئی دنیا میں مسلم ہند کو ایک نئے شہاب الدّین غوری کی تلاش تھی جو ایسی نئی فتوحات کرے جن کا اثر صدیوں تک محسوس ہو۔ یہ کام قائدِ اعظم نے کیا۔ تن تنہا اور صرف

سات برس میں۔ سارے دوست جب قائدِ اعظم کے بارے میں اس رائے پر متّفق ہوئے تو ہمیں وہ شخص بے اختیار یاد آیا جو یہ کہتا تھا کہ تاجر پیشہ باپ کا وکیل بیٹا جس کے پاس ایک بیگھا زمین تک بھی نہ تھی اُسے بھلا حکومت اور سیاست سے کیا نسبت۔ وہ شخص انتقال کر چکا ہے اِس لیے یہ معاملہ ہم نے خُدا پر چھوڑ دیا۔

قائدِ اعظم کا انتقال ہوا۔ اُن دِنوں میں کراچی میں رہتا تھا۔ مدّت کے لحاظ سے اس واقعہ کو چوبیس برس گزر چکے ہیں۔ حالات کے لحاظ سے یہ بات اور زیادہ پرانی لگتی ہے۔ میں سوچتا ہوں تو بات کل کی معلوم ہوتی ہے۔

کراچی جسے پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا تھا، ایک چھوٹا اور ستھرا سا شہر ہوا کرتا تھا۔ اِس شہر کو آج کل کے شہر سے صرف یہ نسبت ہے کہ وہ بھی اِسی جگہ آباد تھا۔ اِس شہر کے وہ علاقے جہاں ہو کا عالم ہوا کرتا تھا اور جِن کا حقِ ملکیت بیس پیسے فی گز کے حساب سے ایک پوری صدی کے لیے مل جاتا تھا آج وہاں کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی اور میونسپل کارپوریشن وہاں موٹر کار روک لینے پر ایک

روپیہ فی گھنٹہ ہرجانہ وصول کرتی ہے۔ جب اس شہر کے دِن بدلے تو اِس کے حصّے میں حکومت اور دولت کے ساتھ ایک ہجوم بھی آیا۔ اگرچہ دارالحکومت بنے ہوئے اِسے مشکل سے ایک سال ہوا تھا مگر ہجوم کا یہ عالم تھا کہ ہمارے مالک مکان نے عمارت کے ایک ایک حصّے کو علیحدہ علیحدہ ماہانہ، یومیہ اور گھنٹوں کے حساب سے کرائے پر چڑھایا ہوا تھا۔ ہم تین دوست پاکستان چوک کے ایک فلیٹ کی نِچلی منزل کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ ہمارے کمرے کی دو کھڑکیاں سڑک پر کھلتی تھیں، جن میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ مالک مکان کھڑکی کی یہ سلائیں رات کو کرائے پر اُٹھا دیتا تھا۔ ہم کھڑکی کھول کر سوتے اور رات کو سائیکل رکشا والے اپنی اپنی رکشا اِن سلاخوں سے باندھ دیتے تاکہ چوری نہ ہو جائیں۔ مُنہ اندھیرے وہ اپنی زنجیریں اور تالے کھولتے اور اُن کے شور سے ہماری آنکھ کھُل جاتی۔ اخبار والا بھی اِسی کھڑکی سے اخبار اندر چارپائی پر ڈال جاتا اور ہم صُبح اُٹھتے ہی اخبار پڑھنا شروع کر دیتے۔

اس روز کچھ اور ہی نقشہ تھا۔ صُبح آئی مگر خالی ہاتھ اور بہت دیر سے۔ آنکھ کھُلی تو

رکشا زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ دودھ ڈبل روٹی والا اور صُبح کے دوسرے پھیری والے غیر حاضر تھے۔ سڑک سُنسان تھی۔ علی الصباح کی آواز میں خاموش تھیں۔ زندگی اور معمول کے آثار صرف اتنے تھے کہ کھڑکی میں ڈان اخبار رکھا ہوا تھا اور اُس میں سیاہ حاشیے کے ساتھ قائدِ اعظم کے انتقال کی خبر درج تھی۔ اب سمجھ میں آیا کہ سنّاٹا کیوں طاری ہے۔ جو شخص بھی جاگا اور اُس نے یہ خبر سُنی وہ سکتے میں آگیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے غم کا اظہار کیسے کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد جیسے کراچی بھر کے لوگوں کی سمجھ میں بیک وقت ایک ہی بات آئی۔ وہ گھروں سے دیوانہ وار نکلے اور گورنر جنرل ہاؤس کی طرف رُخ کرلیا۔ گورنر جنرل ہاؤس کے باہر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہاں پورچ میں قائدِ اعظم کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔ لوگ قطار اندر قطار وائی ایم سی اے کے بالمقابل دروازے سے داخل ہوتے اور جم خانہ کلب کی جانب گیٹ سے باہر چلے جاتے۔ گھنٹوں بعد میری باری آئی۔ جب لمحہ بھر کے لیے میں ہجوم کے ریلے کے ساتھ پورچ سے گُزرا تو دائیں طرف قائدِ اعظم کی میّت کفن میں لپٹی ہوئی رکھی تھی۔

ذرا سا چہرہ کھُلا تھا اور اُسے دیکھنے کے باوجود مجھے قائدِ اعظم کی موت کا یقین نہ آیا۔ یہ چہرہ مجھے نا آشنا سا لگا۔

میں نے قائدِ اعظم کو پہلی بار ۱۹۳۸ء میں دیکھا تھا۔ علی گڑھ کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر ایک چھوٹا سا ہجوم جمع تھا۔ ریل آئی تو اس ہجوم میں ذرا سی ہلچل ہوئی۔ پہلے درجے کے ڈبّے سے جو شخص نکلا وہ کسی تکلّف یا توقّف کے بغیر سیدھا لوگوں کے دِلوں میں اُتر گیا۔ روشن بیضوی چہرہ، چمک دار آنکھیں اور گونج دار آواز، کم گُو اور کم آمیز خاموشی میں با وقار اور گفتگو میں با رُعب۔ استادگی میں اتنے سیدھے کہ اپنی بُلند قامت سے بلند تر اور اپنی پختہ عمر سے کم تر لگتے تھے۔ کوئی شخص اُن کی مقناطیسیت سے بچ نہ سکا اور ہر شخص اُن کی برتری کا قائل ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں پلیٹ فارم پر استقبال کرنے والوں کا ہجوم چھٹ گیا۔ یہ ہجوم اُس ہجوم سے کہیں کم ہے جو چند ماہ بعد اُن کے استقبال کو اِسی جگہ جمع ہو گا۔ اِس کے بعد وہ سال میں دو بار علی گڑھ آیا کریں گے اور ہر بار ہجوم اور اُس کا شوق بڑھتا جائے گا یہاں تک کہ لوگ اِس شخص کا تصوّر ہجومِ شوق کے بغیر نہ

کر سکیں گے۔

قائدِ اعظم حبیب منزل میں ٹھہرا کرتے تھے۔ یہ میرس روڈ پر نوّاب صدر یار جنگ کی کوٹھی تھی۔ ان دِنوں کے معیار سے یہ ایک چھوٹا سا محل تھا۔ اِس محل کو سر مزّمل اللہ خاں کے مزمل پلیس، نوّاب چھتاری کی سعید منزل اور دوسرے رؤسا کی کوٹھیوں پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ بھیکم پور کا رئیس ایک معروف علم دوست اور دین دار شخص تھا۔ حبیب الرحمان خان شیر وانی خوش مذاق بزرگ تھے۔ اُن کا قلمی کتب خانہ بہت مشہور تھا اور لوگ اُن کی وضع داری، اصول پسندی اور علم و فضل کے قائل تھے۔ اُن کی دوستی اُن کے علم کی طرح وسیع اور متنوّع تھی۔ جن دِنوں قائدِ اعظم اُن کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے، انہی دِنوں قلعہ احمد نگر کا ایک اسیر انہیں خط لکھتا اور جمع کرتا جاتا تھا۔ یہ خط اُس زندانی کی رہائی کے بعد غبارِ خاطر کے عنوان سے شائع ہوئے اور یوں ابو الکلام آزاد کی نثر کے وسیلے رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کا نام اُردو کی تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔

ریاض الرحمان خان شیر وانی سکول میں میرے ہم جماعت تھے۔ چونکہ وہ نوّاب

صاحب کے پوتے تھے اس لیے ہم لوگ حبیب منزل جا پہنچے اور ریاض الرحمان کو تلاش کرنے کے بعد اُن سے یہ فرمائش کی کہ ہمیں محمد علی جناح بیرسٹر کی ایک جھلک دکھا دیں۔ بھیڑ چھٹ چکی تھی اور ملاقاتی واپس کیے جا رہے تھے۔ قائدِ اعظم وسیع ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھے تھے۔ اسکول کے دو چار بچے سہمے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ قائدِ اعظم صوفہ کرسی پر خاموش بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عام طور پر غور و فکر کے انداز میں بے ڈھنگ نشست، بے وضع لباس، بے ترتیب بال اور کسی قدر بند آنکھیں شامل ہوتی ہیں۔ یہاں معاملہ اُس کے برعکس تھا گویا گہری سوچ بھی ایک باضابطہ عمل ہے۔ قائدِ اعظم یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی مصوّر کا ماڈل ہو۔ اُن کی نشست کے اوپر چھت پر ایک فانوس آویزاں تھا اور اُن کے قدموں میں شیر کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ قائدِ اعظم سے ملاقات کے بارے میں میرا پہلا تاثر تین علامتوں کے ساتھ وابستہ ہے، خاموشی، فانوس اور شیر۔ جب بھی مزارِ قائدِ اعظم پر حاضری دیتا ہوں یہ علامتیں یاد آ جاتی ہیں۔ وہاں موت کی خاموشی بھی

ہے اور چین سے آیا ہوا فانوس بھی لیکن شیر کی علامت میرے لیے ابھی تک معمّا بنی ہوئی ہے۔

چند ماہ بعد قائدِ اعظم دوبار علی گڑھ آئے۔ ابھی قرار دادِ پاکستان کے پیش کرنے اور منظور ہونے میں سال بھر پڑا تھا مگر قائدِ اعظم برِّ عظیم کے مسلمانوں کے واحد اور سب سے بڑے رہنما تسلیم کیے جا چُکے تھے۔ یہ وہ شب و روز تھے جب قائدِ اعظم کی شہرت اور اُن کی جماعت کی مقبولیت کو دِن دونی اور رات چوگنی ترقّی نصیب تھی۔ چند ہی مہینوں میں اِتنا فرق پڑا کہ سارے شہر اور یونیورسٹی کے مسلمان ریلوے اسٹیشن پر اُمڈ آئے۔ سب ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھے۔ بچّوں نے بچّہ مُسلم لیگ بنا ڈالی۔ نوجوانوں نے گاہے گاہے جان کی قربانی دینی شروع کر دی۔ بوڑھوں نے مسلم لیگ کی رُکنیت کے فارم پُر کر دیے۔ آخر پردہ دار عورتیں کیوں پیچھے رہ جاتیں، انھوں نے بھی یونین ہال میں قائدِ اعظم کے لیے جلسہ کر ڈالا۔ یونین ہال کی سڑک پر پہلی بار تانگوں کی قطار لگ گئی۔ اِن تانگوں پر پلنگ کی سفید چادریں بندھی ہوئی تھیں اور اندر سواریاں

برقع پہنے ہوئے تھیں۔ ہال میں ڈائس کے پیچھے چقیں لگی ہوئی تھیں۔ اُن کے پیچھے عورتیں اور لڑکیاں آکر بیٹھ گئیں۔ خواتین کا ایک ایسا جلسہ اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پردہ دار عورتوں کا جوش و خروش اور اُن کی تعداد دیکھ کر یقین ہوگیا کہ اب مسلم سیاست میں پورا انقلاب آچکا ہے۔ قائدِ اعظم اِس بار علی گڑھ کیا آئے کہ لوگ سر سیّد کے خواب کی تعبیر اور اقبال کے اشعار کی تاثیر کا ذکر کرنے لگے۔

جلسہ ختم ہوا تو قائدِ اعظم سبزہ زار میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہاں بہت سے گروپ فوٹو لئے گئے۔ تصویر کشی ختم ہوئی تو لڑکے لڑکیاں اپنی اپنی آٹو گراف البم لے کر آگئے۔ میں بھی اُن میں شامل تھا۔ قائدِ اعظم ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے تھے اور آٹو گراف البم اپنے پہلو پر رکھ کر دستخط کر رہے تھے۔ یہ بات شاید انہیں ناگوار تھی اور یوں لگتا تھا کہ وہ اُٹھنا چاہتے ہیں۔ مجھے پریشانی ہونے لگی کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اُٹھ جائیں اور میں آج اُن کے دستخط حاصل نہ کر سکوں۔ یہ دستخط میرے لئے بہت اہم تھے کیونکہ میں نے پروفیسر ابراہیم شاکیوچن کے

دستخط حاصل کرنے کے بعد پہلی بار کسی بڑے آدمی سے اُس کے دستخط چاہے تھے۔ کیوچن مُجھے اپنے گھر کے صحن میں آرام سے چائے پیتے ہوئے ملے تھے اس لیے دستخط لینے میں کوئی دقّت پیش نہ آئی۔ قائدِ اعظم کے چاہنے والے بے شمار تھے اور ہر ایک اُن کی توجّہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے گھبرا کر البم قائدِ اعظم کے سامنے کر دی، وہ ابھی دوسری البم پر دستخط کر رہے تھے۔ ایک رعب دار آواز آئی wait۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی میرے ہاتھ سے آٹو گراف البم لی اور دستخط کر دیے۔ یہ اپریل ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔

قائدِ اعظم کے دستخط حاصل کرنے کے بعد تیرہ برس تک وہ صفحہ خالی رہا جو اُن کے مقابل تھا۔ میں نے قائدِ اعظم کو پہلی بار اُن کی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کے ساتھ دیکھا تھا لہٰذا یہ صفحہ اُن کے لیے خالی چھوڑ دیا۔ مس جناح کے دستخط حاصل کرنے کے لیے میں نے کوئی کوشش نہ کی البتّہ اِس کی خواہش ضرور رکھتا تھا۔ یہ خواہش قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد اور زیادہ ہو گئی۔ بالآخر ایک دِن اِس کو پورا کرنے کا موقع بھی نکل آیا۔ جن دِنوں میں ملازمت کی تربیت ختم کرنے کے بعد

لائل پور میں تعینات ہوا، مس جناح وہاں تشریف لائیں۔ دو چار دِن رہنے کے بعد انہیں لاہور جانا تھا۔ گورنر پنجاب نے اِس سفر کے لیے اپنی موٹر بھیجی تھی۔ مجھے حکم ملا کہ افسر مہمان داری کے خوشگوار فرائض ادا کرتے ہوئے میں لائل پور سے لاہور تک اُن کے ساتھ اِس موٹر میں سفر کروں۔

مس جناح نے راستے میں بہت سی باتیں کیں اور یہ اکثر صاف اور کھری باتیں تھیں۔ مس جناح نے بتایا کہ قائدِ اعظم نے لیاقت علی خاں کی سوجھ بوجھ پر لیاقت ڈیسائی پیکٹ کے بعد کبھی بھروسہ نہ کیا اور اگر وقت اور واقعات کی رفتار اتنی تیز نہ ہوتی تو وہ ضرور کسی اور شخص کو اُن کی جگہ دے دیتے۔ محترمہ نے یہ بھی کہا کہ ہیکٹر بولیتھو کو قائدِ اعظم کی سوانح عمری لکھنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے تاکہ وہ لیاقت علی خاں کے کام کو بڑھا کر پیش کرے۔ جب ہیکٹر بولیتھو کی کتاب اِس گفتگو کے چار سال بعد چھپ کر آئی تو میں نے اُس کی ایک جلد خاص طور پر کراچی سے منگائی اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مس فاطمہ جناح کے خدشات بالکل درست تھے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ پاکستان کی سمت کا فیصلہ بڑی حد تک

جولائی ۱۹۳۲ء میں اس روز ہو گیا تھا جب لیاقت علی خاں ہمسٹیڈ ہیتھ گئے تا کہ جلا وطن جناح سے گفتگو کریں۔ یہی نہیں بلکہ اِس کتاب میں بیگم رعنا لیاقت کے ذکر کے ساتھ یہ اشارہ بھی ہے کہ قائدِ اعظم اپنے خط میں لیاقت علی خان کو لکھا کرتے تھے کہ میرا دِل تُم دونوں کے ساتھ ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کتاب کے پانچویں باب میں بیگم لیاقت کی زبانی اس خیال کو بھی غلط ثابت کیا گیا ہے کہ اگر قائدِ اعظم کو حالات فرصت دیتے تو وہ لیاقت علی خاں کو علیحدہ کر دیتے۔ بیگم لیاقت اِس مفروضے کو مہمل قرار دیتی ہیں ممکن ہے یہ سچ ہو مگر مجھے بولیتھو کی ساری کتاب ہی مہمل معلوم ہونے لگی۔

مس فاطمہ جناح کا ایک بار ہم سفر ہونے کے بعد اُن سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ جب میں موہٹہ پیلس میں داخل ہوا تو اُن کے انتقال کو دو تین برس ہو چکے تھے۔ گھر میں شیریں بائی اور اکبر بھائی کے علاوہ حسرت، مقدمہ بازی اور پہرہ داروں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ جتنی دیر میں اور برنی وہاں بیٹھے رہے ایک شخص ہم سب کے اعصاب پر سوار رہا۔ بے چارہ نوکری کر رہا تھا۔ میں نے یہ جانتے

ہوئے کہ قائدِ اعظم اِس گھر میں کبھی نہیں رہے اِس کا ہر کمرہ پھر کر دیکھا۔ گھر سونا سونا تھا۔ قائدِ اعظم کا سامان عجائب گھر والے لے گئے اور کاغذات ایک کمیٹی لے گئی۔ جو کچھ اُن دِنوں بچ رہا اور ابھی تک گُم نہ ہوا وہ گھر میں موجود تھا۔ مجھے ناکارہ فرنیچر اور شکستہ موٹر کار نے بہت اداس کیا۔ شاید میں وہاں اِسی لیے گیا تھا۔ تقریباً چالیس سال پرانے فرنیچر سے قائدِ اعظم کے مذاق کا اندازہ ہوتا تھا۔ چوبی نقش و نگار کے پیچیدہ نمونے جن میں کندہ کار کی اَن تھک محنت نے بے پناہ حسن پیدا کیا تھا۔ قائدِ اعظم کی زندگی بھی ایک کندہ کار کی زندگی تھی، وہ لوگ جو کندہ ناتراش کہلاتے تھے، ایک روز اُن کی قیادت میں دنیا کی پانچویں بڑی ریاست کے وارث بن گئے۔ جس روز اُس وراثت کا تاجِ برطانیہ کی طرف سے باضابطہ اعلان ہونا تھا، ماؤنٹ بیٹن کراچی میں قائدِ اعظم کے ساتھ اُن کی سفید پیکارڈ موٹر کار میں بیٹھ کر مجلسِ آئین ساز کی افتتاحی تقریبِ آزادی میں شریک ہوئے تھے۔ یہ موٹر اب موہٹہ پیلس میں اینٹوں پر کھڑی ہے۔ یہ ایک شکستہ اور خستہ ڈھانچہ ہے۔ اس پر منوں مٹّی پڑی ہے۔ جس دامن سے ہم نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو

خاک جھاڑی تھی وہی پھر خاک سے اَٹ گیا ہے۔

میں نے شیریں بائی سے یہ پوچھا کہ آپ کے خاندان میں کس کی شکل قائدِ اعظم سے ملتی ہے۔ کہنے لگیں یہ میرا بیٹا اکبر بھائی جو آپ کے سامنے ہے، ویسے کچھ شباہت محمد علی میں بھی ہے۔ میں نے غور سے اکبر بھائی کو دیکھا۔ وہ بات تو ہر گز نہ تھی مگر اِس سے کچھ تعلّق ضرور تھا، مجھے قائدِ اعظم بے اختیار یاد آنے لگے۔

میں قائدِ اعظم کے سامنے کھڑا ہوا اور کانپتی ہوئی آواز میں ایک نظم پڑھی، میں نے چند ماہ پہلے میٹرک پاس کیا تھا اور یونیورسٹی میں کسی موقع پر ترنّم سے نظم پڑھنے کا یہ پہلا اور آخری واقعہ تھا۔ یہ نظم میرے استاد مولانا عقیل الرحمان ندوی کی لکھی ہوئی تھی۔ عقیل الرحمان صاحب سکول میں فارسی پڑھایا کرتے تھے اور اُن میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں۔ علم، شاعری، اخلاق، خودداری۔ اُن کی زندگی سادگی اور فقر سے عبارت تھی۔ اُن کی نظر میں کچھ ایسا اثر تھا کہ اُس کا فیض میں آج بھی اپنی زندگی میں پاتا ہوں۔ میں گیارہ بارہ برس کا تھا تو شہر میں پاسپورٹ سائز کی تصویر کھینچنے کی ایک خودکار مشین نصب ہوئی۔ میں نے شوق

سے تصویر اُتروائی اور دوسرے دِن اُسے سکول لے گیا۔ سبق ہو رہا تھا مگر جو لڑکا میرے ساتھ بیٹھا تھا اُس نے تصویر لے کر پہلے دیکھی اور پھر چُپکے سے آگے بڑھا دی۔ وہ تصویر ہاتھوں ہاتھ کلاس میں بہت دُور نکل گئی۔ بالآخر مولانا عقیل الرحمان نے دیکھ لیا۔ پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جس کے ہاتھ میں تصویر تھی اُس نے ڈر کر اُسے اُستاد کی میز پر رکھ دیا۔ سب اِس انتظار میں تھے کہ اب ڈانٹ پڑے گی اور سزا ملے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ مولانا نے تصویر کو غور سے دیکھا پھر اُس پر سعدی شیرازی کا ایک دعائیہ شعر اپنے خوبصورت خط میں لکھ کر مجھے تصویر واپس کر دی۔ یہ تحریر اور تصویر اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اور وہ نصیحت جو مولانا نے مجھے ایک بار کی تھی اُس کا نقش بھی میرے دل پر آج تک اُسی طرح محفوظ ہے۔ میں نے اقبال کی ایک طویل نظم بھی اُس شفیق اُستاد سے کوئی دو ہفتے تک اُن کے گھر جا کر پڑھی۔ وہ اقبال کے سلسلے میں میرے خضرِ راہ ثابت ہوئے۔ اقبال سے اُن کو بہت عقیدت تھی اور وہ نظم جو خاص طور پر قائدِ اعظم کی آمد پر لکھی گئی اور اسٹریچی ہال میں مجھے پڑھنے کے لیے دی گئی وہ بھی اقبال کی زمین میں

تھی۔ اُن دِنوں سیاسی جلسوں میں اکثر طلوعِ اسلام کا وہ بند پڑھا جاتا تھا جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں

اسی بند میں اقبال کا وہ مصرعہ بھی شامل ہے جسے جوہری توانائی کے بارے میں شاعرانہ دریافت کی سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مصرعہ یہ ہے۔

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّہ کا دل چیریں

مولانا عقیل الرحمان نے اِس مصرعہ میں یوں تصرف کیا۔

محمد ہی لکھا ہو گا اگر مسلم کا دل چیریں

اس نظم کے پڑھنے کے چند ماہ بعد مولانا عقیل الرحمان ندوی جوانی میں انتقال کر گئے اور اُن کی دو بچیاں یتیم ہو گئیں جن کے نام انہوں نے محمدی اور احمدی رکھے تھے۔ قائدِ اعظم جب اگلی بار علی گڑھ آئے تو انہیں طلبا کی یونین کی طرف سے

ایٹ ہوم دیا گیا۔ اس چائے میں یونین کے عہدے دار، مقرّر اور چند منتخب طلبا شریک ہوئے، چائے کے دوران قائدِ اعظم ہر میز پر گئے اور مصافحہ کیا۔ یونین کے نائب صدر شاکر حسن نے میرا تعارف کرایا اور کچھ تعریف کی۔ قائدِ اعظم لمحہ بھر کے لیے رُکے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر کچھ یوں بولے۔ تحریکِ پاکستان کو لیاقت اور صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کی بہت ضرورت ہے۔ اُن کے مخاطب ہم سب طلبا تھے جو اُن کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ قائدِ اعظم ذرا سی دیر میں دوسری میز کی طرف چلے گئے اور میں نے اُس لمس اور لمحے کو زندگی کی بہترین یادوں میں شامل کر لیا۔ اِس کے بعد قائدِ اعظم کتنی دفعہ علی گڑھ آئے اور میں نے انہیں دور و نزدیک سے کئی بار دیکھا۔ اکثر بھیڑ کی وجہ سے مجُھے اُن کی تقریر کھڑے ہو کر سُننی پڑی مگر دو ایک تقریریں میں نے اُن کے قدموں میں بیٹھ کر بھی سُنی ہیں۔ اُن دِنوں ان کے قدموں میں بیٹھنے کے لیے بھی مقابلہ ہوتا تھا مگر آج اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والا ایک بھی نظر نہیں آتا۔

قائدِ اعظم کی تقلید اور پیروی آسان تھی مگر اُن کے نقشِ قدم پر چلنا بہت دشوار

ہے۔ قائدِ اعظم کی زندگی میں اُن کے چاہنے والے اور ماننے والے اَن گنت تھے۔ وہ اپنی زندگی کچھ اِس طور سے بسر کر گئے کہ اُن کے انتقال کو خواہ کتنی ہی مدّت گزر جائے برِّ عظیم میں اُن کے پیرو کم نہ ہوں گے۔ یہ بھی ایک کرشمہ ہے۔ علمِ سیاسیات میں کامیاب رہنما کی خوبیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اگر دقّت پیش آئے تو گرفت میں نہ آنے والی خوبیوں کو کرشمہ کہہ کر فہرست مکمّل کر لیتے ہیں۔ قائدِ اعظم کوئی حل نہ ہونے والا معمّا یا سمجھ میں نہ آنے والا اتّفاقی حادثہ نہ تھے۔ اُن کی بڑائی تو اِس بات میں تھی کہ لوگ اُن کے بارے میں سب کچھ جاننے ہی کی وجہ سے انہیں ایک بُلند طبع شخصیت مانتے اور پکار اُٹھتے

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

قائدِ اعظم کی مشکلات کا اندازہ لگائیں تو اُن کی خوبیاں سامنے آ جاتی ہیں۔ جب قائدِ اعظم نے تحریکِ پاکستان کی قیادت قبول کی تو اُس وقت مخالف اُسے دیوانگی اور ناممکنات میں شامل کرتے تھے۔ جس نے ذرا رحم دکھایا اُس نے اُسے شاعر کا خواب ٹھہرایا۔ سائمن کمیشن کے سامنے اُس شخص نے اِسے طلبا کی خام خیالی کہا

تھا جس نے اِس ملک کی پہلی کابینہ میں شریک ہونا تھا۔ مسلمانوں کی اجتماعی صورت یہ تھی کہ وہ نام کی جماعت تو رکھتے تھے مگر جمعیت بالکل منتشر تھی۔ برطانوی ہند کے مسلمان عام طور پر ایسی صوبائی قیادت کے زیرِ اثر تھے جو علاقائی وفاداریوں سے بُلند نہ تھی۔ ریاستوں کے مسلمان علاقائی قیادت سے بھی محروم تھے کیونکہ ریاست میں ہر کام کا محور دربار اور اُس کی پست سازشیں تھیں۔ علما کانگرسی تھے اور مسلم لیگ کنگال تھی۔ کسمپرسی کا یہ عالم تھا کہ برِّ عظیم میں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والی جماعت کے پاس مدّت تک ایک انگریزی روزنامہ بھی نہ تھا۔ معاشی طور پر مسلمان بہت پسماندہ تھے اور تجارت یا صنعت کے کسی شعبے میں اُن کا کوئی اثر نہ تھا۔ تعلیم کے میدان میں بھی وہ بہت پیچھے تھے۔ اُن کی صرف ایک یونیورسٹی تھی اور اُسے قائم ہوئے بھی چند سال ہوئے تھے۔ جو تعلیم حاصل کرتا وہ انگریز کی ملازمت میں آجاتا اور سیاست کو اُس کی تعلیم سے فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچتا تھا۔ زمینداری میں کچھ حصّہ مسلمانوں کا ضرور تھا۔ ایک سابق حکمران طبقے کی حیثیت سے اور دوسرا انگریز

حکومت کی نو آباد زمینوں کی تقسیم کی بدولت۔ چونکہ زمینداری حکومت کی سرپرستی کے بغیر ممکن نہ تھی لہٰذا اِس طبقے کو انگریز پرست ہونے کی وجہ سے ٹوڈی کا خطاب ملا۔ یہ سر اور خان بہادر کے ان خطابات کے علاوہ تھا جو ہر سال یکم جنوری کو تقسیم ہوتے تھے۔

اِن حالات میں ایک شخص مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے لیے اُٹھا۔ اِس میں بظاہر ہر اُس بات کی کمی تھی جو اِن دِنوں ایک مسلمان سیاست دان کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ یہ شخص کئی سال سے لندن میں رہتا تھا لہٰذا ہم وطنوں کے لیے جلاوطن اور اجنبی سے زیادہ حیثیت نہ تھی۔ وہ عالمِ دین بھی نہ تھا بلکہ بود و باش سے بالکل انگریز لگتا تھا۔ اُسے عربی اور فارسی سے کوئی تعلّق نہ تھا حتّٰی کہ اُسے اُردُو بھی نہیں آتی تھی۔ اُس کا قیام برِّ عظیم کے ایسے علاقے میں تھا جو مجوزہ پاکستان کی سرحدوں کے علاوہ برطانوی ہند کے دارالحکومت اور سیاسی مراکز سے بھی بہت دور واقع تھا۔ اُس کی ذاتی زندگی میں بڑی تنہائی تھی۔ بیگم اُس کی زندگی میں بہت دیر سے داخل ہوئیں اور بہت جلد نکل گئیں۔ دوست بہت کم اور اولاد

واحد اور عاق۔ زندگی کی تمام آسائشیں اُسے حاصل تھیں، اور عمر ساٹھ برس کی تھی۔

مسلمانوں کی قیادت کے دعویٰ کا مطلب انگریزوں اور ہندوؤں کی مخالفت مول لینا تھا۔ بدیسی حکومت کی مخالفت آسان نہ تھی۔ جارج پنجم کی بادشاہت تھی اور انگریز کی سلطنت پر ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ ہندو اکثریت میں تھے۔ تعلیم اور تجارت میں آگے، تنظیم میں بہت آگے۔ اُن کے پاس رہنماؤں کی کھیپ کی کھیپ تیّار تھی اور بعض اتنے مقبول تھے کہ اپنی زندگی ہی میں مہاتما اور دیوتا بن گئے تھے۔ انگریز اور ہندو دونوں اپنے نفع نقصان کے معاملے میں بہت دور اندیش تھے اس لیے آزادی کی تحریک کے باوجود ایک دوسرے کے حامی بھی تھے۔

اس سیاسی پس منظر میں محمد علی جناح کی شخصیت سامنے آئی، وہ آیا، اس نے دیکھا اور وہ سب پر چھا گیا۔ منتشر اور مایوس لوگ متّحد اور پُر اُمّید ہو گئے۔ منتشر تھے تو قومیت کہلاتے تھے۔ متّحد ہوئے تو قوم بن گئے۔ مایوس تھے تو علیحدہ ووٹ کا

حق مانگتے تھے، پُر اُمّید ہوئے تو علیحدہ وطن کا مطالبہ کرنے لگے۔ جو کل تک برِّ عظیم میں محکوم اقلیت سمجھے جاتے تھے وہ اُس کے چوتھائی حصّے میں حکمران اکثریت بن گئے۔ سات سال کے مختصر عرصے میں وہ تحریک جسے دیوانگی، خام خیالی اور محض شاعری کہا جاتا تھا فرزانگی، پختہ کاری اور نثر میں لکھی ہوئی تاریخ بن کر سامنے آگئی۔

وہ بات جو بظاہر سب کو ناممکن نظر آتی تھی ایک فردِ واحد نے آن واحد میں ثابت کر دی۔ کامیابی جب اتنی بڑی ہو تو اُسے معجزہ کہتے ہیں اور ایسے معجزات کو تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ کارلائل کہتا ہے کہ تاریخِ عالم محض بڑے آدمیوں کی سوانح کا نام ہے۔ یہ بات اِس حد تک بالکل درست ہے کہ ہم قائدِ اعظم کی سوانح کو تحریکِ پاکستان کی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔

کارلائل نے یہ بھی کہا تھا کہ بڑا آدمی آسمان سے گرنے والی بجلی کی طرح ہوتا ہے۔ عام آدمی تو ایندھن ہوتا ہے جو اِس بجلی کے انتظار میں رہتا ہے تاکہ اُس کی بدولت وہ بھی آگ پکڑ لے۔ اِس قول کی روشنی میں ہمیں اُس حرارت کی وجہ

سمجھ میں آگئی جو دِلِ مسلم میں ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔

تاریخ عالم کے بارے میں لائیڈ جارج کی رائے کارلائل سے ملتی جُلتی ہے۔ اُن کی نظر میں یہ خیال بالکل غلط ہے کہ تاریخی واقعات صرف اُن بنیادی اسباب سے ترتیب پاتے ہیں جو ناگزیر ہو جائیں اور اُن کی نزاکت اور اہمیّت میں کسی کو دخل نہیں ہوتا۔ دراصل تاریخ کے نازک مراحل اور فیصلہ کُن لمحات میں ایک غالب آ جانے والی شخصیت کا ظہور حالات کے رُخ کو برسوں اور نسلوں کے لیے بدل دیتا ہے۔ اِس قول کی صداقت میں جدوجہد آزادی کے آخری پیچیدہ اور فیصلہ کُن مرحلے پر ایک ایسی شخصیت کے ظہور میں نظر آئی جس نے حالات کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اپنی مرضی کے مطابق ایک نئے رُخ پر موڑ دیا۔

خالدہ ادیب خانم کہتی ہیں کہ ایسے عظیم انسان جو دِلوں میں گھر کرتے اور تاریخ میں جگہ بنا لیتے ہیں وہ زمانے یا مقام کے فرق کے باوجود ایک دوسرے کی مانند ہوتے ہیں۔ ایک عام آدمی کی تصویر لے کر اگر اُسے ایک ہزار گنا بڑا کر لیں تو وہ ایک بڑے آدمی کی تصویر بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عظیم اور مقبول

شخصیت اپنے عوام کے خیالات اور مزاج کا عکس ہوتی ہے۔ یہ قول بھی ہمیں پسند آیا۔ اور اِس کی رو سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہر بڑا آدمی ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں ایک پوری نسل کو اُس کا سراپا نظر آتا ہے۔ ہماری نسل نے قائدِ اعظم کی ذات میں اپنی جھلک دیکھی تھی اور ہم دوسری نسلوں سے اِس بات میں ممتاز ہیں کہ ہم خود خواہ کتنے ہی کم مایہ کیوں نہ ہوں جب متّحد ہوئے تو ہماری اجتماعی صورت بڑی انمول تھی۔

نطشے نے کہا تھا کہ نپولین کا ظہور انقلابِ فرانس کی وجہ سے ممکن ہوا، لہٰذا یہی خوبی اِس انقلاب کا جواب ہے۔ نطشے کی یہ پُر معنی بات ہمارے حالات کے مطابق بھی ہے۔ غور کریں تو ہم اِس نتیجے پر پہنچیں گے کہ قائدِ اعظم کا ظہور درس گاہِ سر سیّد اور شعر اقبال کی وجہ سے ممکن ہوا اور یہی خوبی علی گڑھ اور پاکستان کا جواز ہے۔

بڑے آدمیوں کے بارے میں ایک غلط فہمی مجھے یہ بھی تھی کہ قدرت نے اُن کے لیے اوصاف اور خوبیوں کی ایک علیحدہ فہرست بنا رکھی ہے جسے عام آدمی کی

دسترس سے بہت دور رکھا جاتا ہے۔ قائدِ اعظم کی ذات کا تجزیہ کیا تو یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی۔ بڑے آدمی میں وہی عام، سادہ اور چھوٹی چھوٹی خوبیاں ہوتی ہیں جن پر ہر شخص کا اختیار ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عام آدمی میں یہ خوبیاں ہوتی ہیں اور خاص آدمی میں اِن خوبیوں کی روح اور اُن کا جوہر ہوتا ہے۔ قائدِ اعظم کی جانی پہچانی ذات میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو سمجھ میں نہ آئے۔ شخصیت کے اعتبار سے وہ ایک سیدھے سادے آدمی تھے۔ اُن کی خاص خاص خوبیوں کی فہرست کچھ یوں بنے گی۔ عزم، عمل، دیانت، خطابت اور خودداری۔ ان کا عزم وہ تھا جسے یقینِ محکم کہتے ہیں۔ اُن کے عمل کا نام عملِ پیہم تھا۔ اُن کی دیانت کو شاعر نے مشربِ ناب اور اُن کی خطابت کو سُخنِ دل نواز کہا ہے۔ اُن کی خودداری نظریۂ خودی کا نمونہ تھی۔ قائدِ اعظم کے اسلحہ میں وہ تینوں شمشیریں شامل تھیں جو جہادِ زندگانی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اُن کے توشہ میں وہ تینوں خوبیاں بھی موجود تھیں جو میرِ کارواں کا رختِ سفر کہلاتی ہیں۔ اُن کے سرد اور نحیف جسم میں ہر دم دِل گرم اور جانِ بے تاب کا لاوا اُبلتا رہتا تھا۔

یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ ایسے شخص کو غیروں نے سمجھا مگر مان کر نہ دیا اور اپنوں نے مانا مگر سمجھ کر نہ دیا اور یہ بھی کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ اُس شخص کی تحریک کو بھی بہت سے لوگوں نے بالکل غلط جانا۔ کہنے والوں نے کہا کہ اِس مطالبے کے صرف دو عناصر تھے۔ ایک شخص کی ہٹ دھرمی اور ایک انبوہ کی فرقہ پرستی۔ کہنے والے یہ بات کہتے آئے ہیں اور کہتے رہیں گے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ اِس رہنما کو بھول جائیں جس نے نظریۂ پاکستان کے بارے میں یہ کہا تھا:

"یہ زندگی اور موت کا معرکہ ہے اور ہماری کوشش صرف اس لیے نہیں کہ ہمیں مادی فوائد حاصل ہوں بلکہ یہ تو مسلمانوں کی بقائے روح کے لیے حیات و ممات کا مسئلہ ہے اور اُسے سودے بازی سے کوئی واسطہ نہیں۔ مسلمانوں کو اِس حقیقت کا پورا احساس ہو چکا ہے۔ اگر ہم شکست کھائیں گے تو سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔ آیئے اِس ولندیزی ضرب المثل کو اپنا دستور العمل بنائیں:

جب انسان دولت کھو دے تو کچھ نہیں ہوتا۔

اگر حوصلہ کھو دے تو بہت کچھ کھو جاتا ہے۔

آبرو چلی جائے تو قریب قریب سب کچھ کھو جاتا ہے۔

لیکن روح مر جائے تو سب کچھ مٹ جاتا ہے۔"

میں نے یہ اقتباس بار بار پڑھا۔ یہ الفاظ اُس شخص کے ہیں جو انتقال کے پچیس برس بعد بھی زندہ باد کہلاتا ہے کیوں نہ ہو

خاک قبرش از من و تو زندہ تر

(۱۴)

وہ بات جو ایک ولندیزی کہانی سے شروع ہوئی تھی ایک ولندیزی کہاوت پر جا کر ٹھہر گئی۔ دِل البتّہ کہیں ٹھہرتا ہی نہیں۔ اُس کا سفر جاری ہے اُس کی جستجو میں کمی نہیں آئی۔ اُس کی آرزو کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ میں جتنی دیر آٹو گراف البم کی ورق گردانی کرتا رہا وہ بے تاب رہا۔ میں نے محسوسات کی داستان سُنائی اور وہ شوق

سے سُنتا رہا۔ میں نے آٹو گراف البم بند کی تو دِل نے کہا تُم کو اتنے سارے لوگ یاد آئے اور مجھے صرف ایک بادشاہ یاد آ رہا ہے۔

بادشاہ نے کہا میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات خوشے سبز ہیں اور سات خشک، تعبیر بتاؤ۔ سب اِس خوابِ پریشاں کی تعبیر بتانے سے عاجز رہے تو ایک زندانی سے جا کر پوچھا جو خُدا کا بھیجا ہوا نبی بھی تھا۔ اُس نے کہا کہ سات سال خوشحالی کے بعد خشک سالی کے سات برس آئیں گے اور جو غلّہ تُم نے جمع کر رکھا ہو گا وہ اُس سب کو کھا جائیں گے۔ صرف وہی تھوڑا سا رہ جائے گا جو تُم احتیاط سے رکھ چھوڑو گے۔ پھر اُس کے بعد ایک سال آئے گا کہ خوب مہینہ برسے گا اور لوگ اُس میں رس نچوڑیں گے۔

میں اِس اشارے کو سمجھ گیا۔ میری آٹو گراف البم کے دو حصّے ہیں۔ یہ نصف بھر چُکی ہے اور نصف خالی ہے۔ پہلا حصّہ خوشحالی کے سات گزرے ہوئے سالوں کی یادگار ہے اور دوسرا اُس خشک سالی کی نشانی۔ قحط الرّجال کے یہ سات سال

اتنے طویل ہو گئے ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ خوب کی تعبیر کے مطابق ایک دِن تو اس قحط کا زور ٹوٹے گا اور پھر وہ سال چڑھے گا جس سال مینہ خوب دِل کھول کر برسے گا۔ میں ایک دشتِ بے آب میں اس بارش کا انتظار کر رہا ہوں اور اِک ہجومِ آبادی میں انسان کی تلاش کر رہا ہوں۔ میرے ایک ہاتھ پر چراغ رکھا ہوا ہے اور دوسرے پر میری آٹو گراف البم اور لب پر یہ شعر ہے

گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

۷۲-۱۹۷۱ء